موجیم کہ آسودگی ما عدم ما است

ما زندہ از آنیم کہ آرام نگیریم

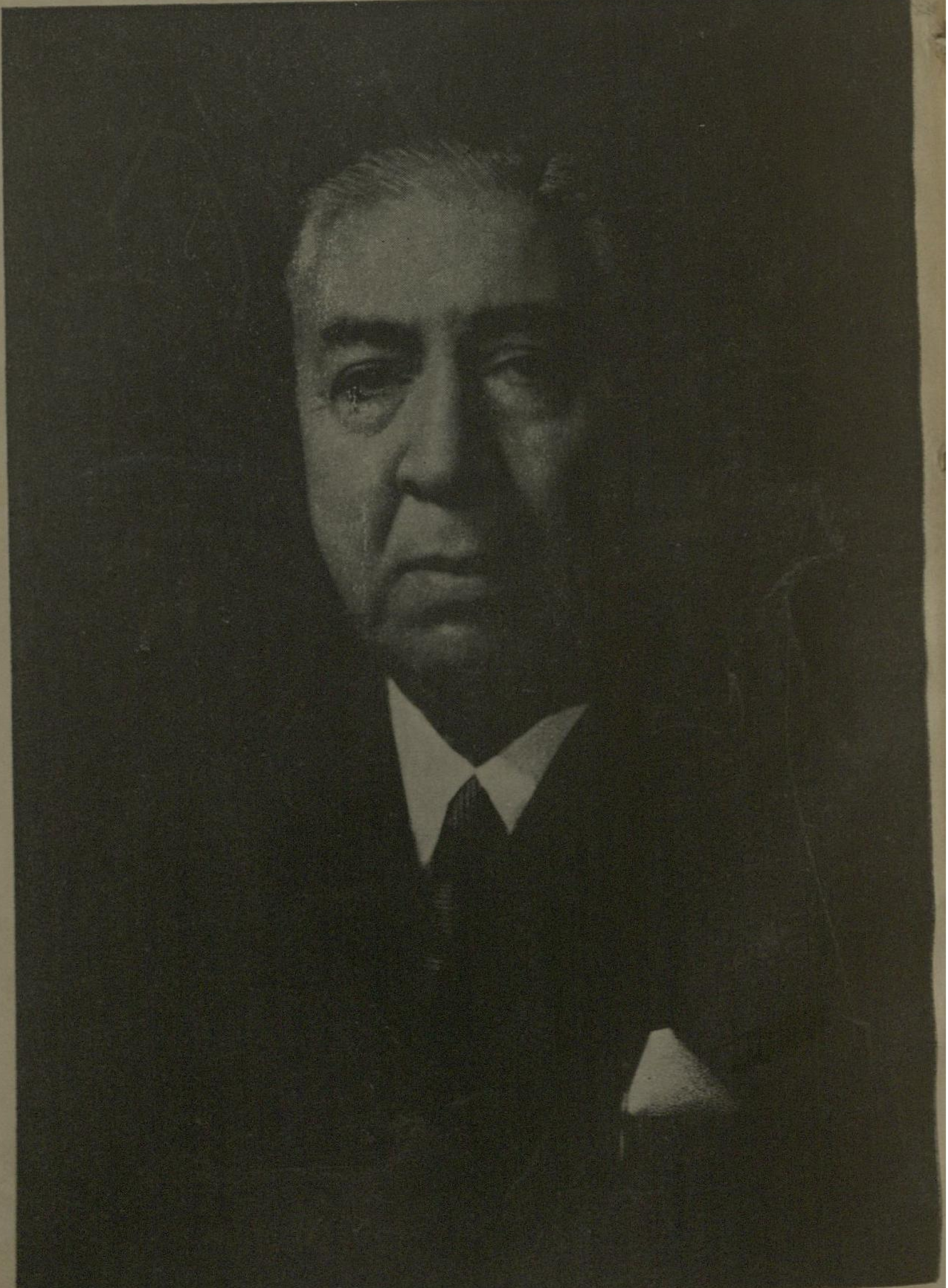
نیا افغانستان

مُصنّف

میجر صاحبزادہ نور محمد شاہ مُصنّف "نور کہستان"

ایبٹ آباد یکم اگست سنہ ۱۹۵۸ء

(منظور عام پریس پشاور میں چھپوایا گیا)



صاحبزاده نور محمد شاه مصنف کتاب

فہرست مضامین

ج

تصاویر :-

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
ما زندہ ازانیم کہ آرام نگیریم

سیاحت افغانستان

تصنیف: صاحبزادہ نور محمد شاہ مصنف "نور کہستان"

ایبٹ آباد یکم اگست ۱۹۵۸ء



محترم جنرل محمد ایوب خان صدر پاکستان

انتساب!

میں اپنی یہ تصنیف اپنے دوست
محترم! قدردان علم و ہنر۔ جرنیل
محمد ایوب خان سپہ سالار افواج پاکستان
کے نام معنون کرتا ہوں

مصنف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میسر عیش اور عشرت کے گو ساماں ہوں لاکھوں
مگر پردیس ہیں۔ یاد وطن کچھ اور کہتی ہے

حرف آغاز :-

خوشا وقتے و خرم روزگارے
کہ بعد از صد ہزاران انتظارے
کسے روئے وطن را باز بیند
چو بلبل روئے گل را در بہارے

مدتوں سے میرے دل میں یہ خواہش جاگزیں تھی کہ مرنے سے پہلے اپنے وطن عزیز اور اپنی جائے پیدائش کو دیکھوں مگر میری اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ آیا موجودہ حکومت مجھے افغانستان آنے کی اجازت دے گی یا نہیں ، مگر بفحوائے کُلّ امرٍ

مرہون باوقا تھا گیا اتفاقاً ماہ فروری ۱۹۵۸ء میں سیر و تفریح کے لئے عازم لاہور ہوا۔ اور اپنے عزیز محترم سردار عبدالرشید خان وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان کے گھر قیام کیا۔ انہیں دنوں ہز ایکسی لینسی محمد اسلم خان خٹک سفیر کبیر دولت پاکستان مقیم کابل بھی سردار صاحب موصوف کے ہاں بطور مہماں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم سب ایک ہفتہ تک یکجا رہے، دوران گفتگو میں وطن کے دیکھنے کی یہ آرزو بھی درمیان میں آئی سفیر موصوف نے کہ خدائے بزرگ و برتر اس کی عمر اور عزت میں برکت عطا فرمائے اور جو مجھے اپنے چچا کے مانند سمجھتا ہے۔ کہا کہ میں اپنی طرف سے کوشش کر کے آپ کی اس خواہش کو پورا کروں گا۔

ایک ہفتہ کے بعد سفیر موصوف کابل تشریف لیگئے اور میں پشاور واپس آگیا چند دن گذرے تھے کہ کابل سے سفیر موصوف کا ٹیلیگرام آیا کہ وزارت خارجہ نے آپ

کے آنے کی اجازت دیکر اپنے قونصل مقیم پشاور کو حکم بھیجا ہے کہ وہ آپ کو ویزہ دیدے۔ مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی کہ خدائے کارساز نے ایسا سبب پیدا کیا کہ چھیاسٹھ سال کے بعد میں اپنے وطن عزیز اور اپنی قوم و قبیلہ کے لوگوں کو دیکھ سکوں گا۔

للّٰہ درہ ماقال۔

حُبِّ وطن از ملک سلیمان خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

۱۸۹۳ء میں ہم جسطرح وطن سے نکل آئے تھے۔ وہ حالات کتاب نورکہستان میں بالتفصیل درج ہیں۔ جو ناظرین پر روشن ہو جائینگے

غرضیکہ میں نے حکومت پاکستان سے پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ اور سفر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ ویزہ بھی ہو گیا۔ اب اس امر کی فکر لاحق تھی کہ میں اپنی موٹر میں سفر کروں یا کرائے کی موٹر میں۔ کوئی کہتا تھا کہ کابل کا راستہ بہت

خراب ہے۔ اپنی موٹر میں سفر نہ کریں کیونکہ راستے میں موٹر
خراب ہو جائے گی۔ کوئی کہتا تھا کہ کابل کا راستہ بالکل درست
ہے بہتر یہی ہے کہ اپنی موٹر میں سفر کیا جائے۔ مختصر یہ کہ جتنے
منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ اطمینان بخش جواب کوئی نہیں دیتا
تھا، اسی لیت و لعل میں تھا کہ میرے ایک محترم چہل سالہ
دوست مسٹر گائے پارسی نے جو افغانستان میں مقیم سفارتوں
کا ایجنٹ اور اس بارے میں پوری پوری واقفیت رکھتا
ہے مجھے مشورہ دیا کہ جیپ کی سواری بہتر ہے۔ میں تمہارے
لئے انتظام کروں گا۔

سفر کابل کی تیاریاں

۱۵ر جون ۱۹۵۸ء کو صبح ۹ بجے میں اپنے کمرے میں بیٹھا
ہوا تھا۔ میرے ماموں زاد بھائی وزیر زادہ محمد یوسف
خان بھی میرے پاس تشریف فرما تھے کہ ڈپٹی کمشنر پشاور
کا اردلی ایک پیغام لیکر آیا۔ کہ نو بجکر پینتالیس منٹ پر سردار
عبدالرشید خان وزیر صنعت پاکستان ہوائی جہاز کے ذریعہ

کراچی سے پشاور پہنچ رہے ہیں ۔ آپ موصوف کے ساتھ کابل جائیں گے ۔ تیار رہیں ۔ میں نے کہا بہت خوب ! وزیر زادہ صاحب موصوف نے حیران ہو کر پوچھا کہ پینتالیس منٹ میں آپ کیسے تیاری کریں گے ۔ میں نے کہا مجھے بارہا اس طرح سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے ۔ اس بارے میں مجھے مشق حاصل ہے ۔ چنانچہ جس وقت میں سفر کی تیاری کر کے ہوائی اڈہ پر پہنچا تو ہوائی جہاز بھی نمودار ہوا ۔ اس ہوائی جہاز میں سردار عبدالرشید خان محمد اسلم خان خٹک خان عطاءاللہ جان سیکرٹری امور قبائل اور میاں ارشاد حسین صاحب جائنٹ سیکرٹری وزارت خارجہ پاکستان تشریف لائے تھے ۔ ان سے ملاقات کرنے کے بعد میں بھی ان کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھ گیا ۔ خدا کی مہربانی اور وزیر صاحب موصوف کے لطف و مرحمت سے ۴۵ منٹ کے اندر ہمارا ہوائی جہاز کابل میں خواجہ رواش کے ہوائی اڈہ پر اترا ۔ میں نے اکثر اوقات افغانستان کی سرحد تورخم

کو دیکھا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کوہ تاترہ کو عبور کرنے کے بعد میدانی علاقہ ہوگا۔ مگر ہوائی جہاز میں دیکھا گیا کہ جلال آباد تک ہوائی جہاز کو کئی پہاڑ عبور کرنے پڑتے ہیں۔

ورود کابل

کابل کا ہوائی اڈہ غیر تار کول شدہ اور خام ہے۔ اس تجارتی وفد کی پیشوائی کے لئے جس کے رئیس سردار عبدالرشید خان تھے۔ پاکستانی سفارت خانے کا کل عملہ ہوائی اڈے پر آیا ہوا تھا، حکومت افغانستان کی طرف سے سردار غلام محمد خان وزیر صنعت اور وزارت خارجہ کی طرف سے فیلڈ مارشل سردار شاہ محمود غازی کے فرزند زلمئی خان نیابت کر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہہ کر باہم مصافحہ اور معانقہ کیا۔ چونکہ آقائے زلمئی خان نے اس سے قبل مجھے گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں دیکھا تھا۔ اس شناسائی کی وجہ سے موصوف نے میرے ساتھ مخصوص توجہ اور مہربانی کا اظہار فرمایا۔

ہم سب موٹروں میں بیٹھ کر مہمان خانہ دارالامان کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں سے دار الامان تک ایک کشادہ سڑک گئی ہوئی ہے۔ جس پر چار موٹر کار پہلو بہ پہلو بلا تکلّف چل سکتے ہیں۔ سڑک پر دونوں طرف سرسبز اور شاداب سایہ دار درختوں کی قطاریں ہر آنے جانے والے کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ کابل سے آٹھ میل کے فاصلہ پر یہ مہمان خانہ حد درجہ جاذب توجہ ہے اعلیٰ فرش و فروش سے آراستہ۔ دو نفر مہمان دار ہوشیار اور باادب۔ متواضع خدمتگار سیاہ بوٹ پتلون اور سفید قمیص اور کوٹ پہنے۔ بو لگائے ہوئے خدمت کے لئے موجود اور مستعد۔

میرا خیال تھا کہ میرا تعلّق اس وفد سے صرف کابل پہنچنے تک ہوگا۔ اور میں سفیر صاحب کے گھر مہمان رہوں گا۔ میں نے اس خیال کا اظہار برخوردار عزیز عبدالغفور خان نائب سفیر سے کیا۔ تو اس نے کہا نہیں۔ حکومت

افغانستان نے آپ کو بھی بہ حیثیت سرکاری مہمان اسی
مہمان خانہ میں ٹھہرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے
آپ بھی یہیں ٹھہریں گے ، ایک نہائیت عمدہ اور آراستہ
کمرہ میرے لئے مختص کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں
جا کر اپنے مہمان دار سے کہا۔ اے وطنی بھائی ! میرا ملازم
میرے ساتھ نہیں۔ اس عمر میں ایک ملازم کے بغیر میرے
لئے ممکن نہیں کہ اپنی ضروریات کو سرانجام دے سکوں.
تم میرے لئے ایک خاص ملازم مقرر کرو۔ مہمان دار نے
کہا بہت اچھا جناب ! انہیں خدمتگاروں میں سے
ایک کو پیش کر کے کہا کہ اس کا نام عبدالستار ہے
یہ خوب تجربہ کار اور ہوشیار آدمی ہے. جب تک آپ
یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں یہ شخص آپ کے ہر کام کاج کے
لئے متعین رہیگا۔ میں نے اپنے سوٹ کیس کی چابی اس
کے حوالے کی اور کہا۔ بھائی تم جانو۔ اور یہ کپڑے انہیں
ترتیب کے ساتھ الماری میں رکھ لو۔

میں خود دوپہر کے کھانے کی میز پر چلا گیا۔ میز پر ہر قسم کے وطنی اور انگریزی کھانے چنے ہوئے تھے، انہیں کے ساتھ قسما قسم کے موسمی میوے بھی موجود تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے مہمان دار سے کہا۔ کہ یہ توت کا موسم ہے، چھیاسٹھ سال سے میرا حلق اپنے وطن کے شیریں اور لذیذ توت سے تر نہیں ہوا۔ کہیں سے توت لانے کا انتظام کرو۔

مہمان دار نے جواب دیا۔ آقا انشاءاللہ دیہہ افغاناں سے آپ کے لئے توت لاؤں گا۔ میں نے کہا کہ اس پر وطنی برف کوٹ کر ڈالنا۔ مشینی برف نہو۔ بہت خوش ہوا۔ اور ہنسکر کہا۔ حضور مجھے معلوم ہو گیا کہ آپ ہر چیز سے واقف ہیں۔ سب کچھ درست کر لوں گا۔

دوسرے دن وہ حد درجہ شیریں اور لذیذ توت لے کر آیا۔ اس کے علاوہ دوسرے میوؤں کے ساتھ وہ تم سق بھی لے آیا۔ جو قندھار کا نہایت میٹھا اور مزے دار میوہ ہے۔

تجارتی وفد کے ممبر مجلس مذاکرات میں شامل ہونے کے لئے افغانستان کے نمائندوں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ اور میں موٹر لے کر سیر و تفریح اور کابل کے بازاروں اور قدیم مقامات کے دیکھنے اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ دوستوں اور قرابت داروں سے خوب ملاقات ہوئی۔

میں اُن کے دیدار سے مشرف اور وہ میری ملاقات سے بے حد محظوظ ہوئے۔ میں نے خدائے مسبب الاسباب کا شکریہ ادا کیا۔ کہ زندگی میں مجھے ایک بار پھر یہ موقع ملا کہ اپنے عزیز وطن اور دوستداران وطن سے ملاقات کروں۔

چرا شکر خدائے خود نہ گویم
کہ آب رفتہ باز آمد بہ جویم

دوپہر کے ایک بجے کے قریب واپس مہمان خانہ آیا۔ میرے ساتھی بھی آئے ہوئے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم نے آرام کیا۔ اور میرے ہمراہی پھر اپنے کاموں میں مصروف

ہو گئے ۔ ہم سب نے عصر کی چائے پی۔ رات کو سفیر کبیر پاکستان کی جگہ پر ایک عظیم الشان دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں افغانی افسر بھی مدعو تھے ۔ رات کو گیارہ بجے تک کھانے پینے اور ہنسنے بولنے کی یہ محفل قائم رہی ۔ دوسرے دن بھی بطریق سابق ...

کابل میں دوست احباب سے مُلاقاتیں

اب کابل کے دوست احباب روزانہ مجھے دوپہر اور رات کے کھانے کی دعوتیں دینے لگے ۔ جن احباب محترم کے ہاں کھانا کھانے کے سلسلے میں اکثر آنا جانا رہا ۔ ان میں اوّل سردار محمد کبیر خان اور ان کی بیگم صاحبہ محترمہ ہیں جن کا ذکر "نور کہستان" میں آچکا ہے ۔ انہوں نے اور ان کے فرزندوں بیٹی اور داماد عزیز نے اس حد تک میری مہمان نوازی میں مبالغہ کیا ۔ گویا میں بھی ان کے خاندان گرامی ہی کا ایک فرد تھا ۔ اُن کے احسان کا گھر آباد رہے ۔ دوم دوست عزیز

سردار محمد رحیم جان اور ان کی بیگم صاحبہ اور فریدہ جان ان کا فرزند اور ہما جان ان کی بیٹی ۔ نیز سردار محمد عتیق خان اور ان کی بیگم صاحبہ اور ان کی شریف و نجیب بیٹی سلمہا ۔ اور محترمہ بی بی گل سلما جان ۔ اور ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر محمد ابراہیم خان اور ان کی ہمشیرہ سیما جان اور دوست محترم سردار محمد یونس خان اور ان کی بیگم صاحبہ اور برخوردار خلیل جان کوہستانی و آقائے سرور گویا و آقائے نور احمد خان معتمدی اور حمیدہ خان کی بیگم صاحبہ اور صدیقہ جان ان کی بیٹی وغیرہ اس مہمانداری میں شامل تھے ۔ میرے رشتہ دار اور عزیزوں میں سے میرے چچا کا نواسہ محمد ناصر جان اور برخوردار محمد کریم جان نیز میرا بھتیجا محمد ایوب جان خسروی وغیرہ جو کابل میں مقیم تھے میری ملاقات کے لئے آئے تھے ۔ جس وقت میرے وطن مالوف کوہستان کے عزیز و اقربا کو میرے آنے کی اطلاع ملی تو وہ بھی رواں دواں میری ملاقات کے لئے کابل آئے چونکہ اس وقت اپنی پدری اور مادری رشتہ داروں میں سب سے زیادہ

معمر ہیں ہوں۔ مگر میری داڑھی منڈی ہوئی مغربی لباس
میں ملبوس سر پہ انگریزی ٹوپ اوڑھے ہوئے تھا۔ اور میرے
بھتیجے اور باقی عزیز و اقارب۔ بڑھی ہوئی داڑھیاں۔ سروں
پر عمامے جسم پہ لمبے لمبے چوغے حسب رواج ملک۔ ہاتھوں میں
تسبیحیں لیے ہوئے۔ ہر ایک میرے ہاتھ پاؤں چومتا تھا میں
وجہ مضحکہ بنا ہوا ان کے اس فعل پر ہنستا تھا۔ میرے منع کرنے
پر بھی وہ ہاتھ پاؤں چومنے سے باز نہیں آتے تھے۔ ہر ایک
کی یہی خواہش تھی کہ میں کوہستان جاؤں۔ جہاں میری
قوم اور قبیلے کا ہر فرد میری دید کا مشتاق تھا، میں خود بھی حد
درجہ خواہش مند تھا کہ اپنے وطن عزیز کو دیکھوں۔ مگر سوال یہ پیدا
ہوتا تھا کہ کوہستان جاؤں تو کیسے؛ چار ماہ قبل میں پشاور میں
گر گیا تھا، جس سے میری کمر کی ہڈی میں سخت چوٹ آئی تھی
ہر چند علاج معالجہ کیا۔ مگر اب تک تکلیف اور درد موجود ہے اس
لئے کسی تکلیف دہ سفر کا متحمل نہیں ہو سکتا
کوہستان کی سڑک کا فاصلہ چار ریکار تک ۸۰ میل ہے،

تخمیناً دس میل تک تو یہ سڑک پختہ اور ہموار ہے باقی زیر مرمت ہے۔ لوگ کہتے تھے اس میں جگہ بہ جگہ گڑھے ہیں راستہ بہت خراب ہے۔ جیپ کے بغیر سفر ممکن نہیں۔ میں جیپ کے جھٹکوں سے ڈرتا تھا۔ میرے ہم قوم کہتے تھے کہ اپنے آنے سے دو روز قبل ہمیں اطلاع دیں تاکہ لوگ آپ کی پیشوائی کے لئے آئیں۔ حاکم اعلیٰ کوہستان سید غلام نبی شاہ صاحب بھی جو کنڑ کے ایک نجیب الطرفین سیّد ہیں آپ کی پیشوائی کے لئے آنے کے خواہشمند ہیں۔ ہم نچارہ بکار سے قلعہ دولانا تک جو تین میل کا راستہ ہے۔ تمام پلوں اور راستوں کی مرمت کرنا ہے جس پر موٹر جا سکتی ہے۔ میں جانے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کرتا تھا۔ تاکہ لوگ پیشوائی کی زحمت سے چھوٹ جائیں اور میرا بھتیجا اس جمِ غفیر کی مہمان داری کے خرچ سے بچ جائے۔

حضرت شاہ ولایت کے مزار فیض آثار کی زیارت کیلئے روانگی ترکستان

اسی دوران میں ایک دن سرکاری مہمان دار نے میرے
کمرے میں آکر کہا کہ آپ کے ہمراہی حضرت شاہ ولایت
علی مرتضےٰ کے مزار فیض آثار کی زیارت کے لئے ترکستان
جا رہے ہیں۔ کیا آپ بھی جائیں گے؟ میں نے پوچھا سفر کا
کیا انتظام ہے۔ کہا۔ ہوائی جہاز کے ذریعہ۔ میں نے کہا۔
ہاں میں بھی جاؤں گا۔ صبح کے وقت ہمارے ہوائی جہاز
نے ترکستان کی طرف پرواز کی۔ راستے میں اس نے میرے
وطن عزیز کوہستان پر سے بھی اڑان کی۔ ہم استالف
گل بہار۔ جبل السراج۔ ریگ رواں۔ چہاریکار اور ان قلعوں
پر سے بھی گذرے جو میرے اجداد کی جائیدادیں ہیں۔ ہمارے
ہوائی جہاز نے اب بلند ہو کر کوہ ہندوکش ہمالیہ کی چوٹی کو جو
برف سے ڈھکی ہوئی اور سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے
عبور کیا۔ ہم گلپوش وادیوں، سرسبز و شاداب مرغزاروں۔ نظر فریب
پہاڑی دروں کی سیر کرتے ہوئے اڑتے ہوئے چلے جا رہے

تھے۔

برسبیل تذکرہ

ان پرندوں مثلاً قرقرہ۔ کلنگ اور مرغابی کی بلند پروازی پر آفریں کہنا چاہیئے۔ جو پہاڑوں کی ان بلندیوں کو عبور کرتے ہیں۔ جب مطلع ابر آلود ہوتا ہے تو یہ پرندے ان پہاڑوں پر سے گذر نہیں سکتے۔ اس وقت یہ واپس آکر ہمارے ملک کوہستان میں ان بڑے تالابوں کے پاس ڈیرہ جماتے ہیں جنہیں ہماری مقامی بولی میں نور کہا جاتا ہے۔ اس موسم میں کوہستان کے شکاری ان کا شکار کرتے ہیں۔ شکار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نور کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے مکان بنا کر اس کو خس پوش کرتے ہیں اس گھر کی دیواروں کے سوراخوں کا رُخ نور کی طرف ہوتا ہے جس وقت پرندے کافی تعداد میں تالاب پر جمع ہو جاتے ہیں تو چار پانچ بندوقچی بندوقوں کی نالیاں ان سوراخوں سے نکال کر جانوروں کی طرف شِصت باندھتے

ہیں۔ ان میں سے ایک جس وقت آواز بند کرتا ہے "ہاؤ" تو سارے بندوقچی ایک دم فائر کر دیتے ہیں۔ جس سے بے شمار پرندے ہلاک اور مجروح ہوتے ہیں۔ جو کلنگ کم زخمی ہوئے ہوں یا ان کے پنکھ ٹوٹ گئے ہوں تو اس پنکھ کی ہڈی کو کاٹ کر اسے تیل سے داغا جاتا ہے۔ ہڈی تو اچھی ہو جاتی ہے۔ مگر کلنگ اڑنے سے رہ جاتا ہے۔ اور اسی تالاب یا قلعہ جات میں خانگی مرغیوں کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔

بسا اوقات انہیں کلنگوں میں سے ایک دو کو تالاب میں رکھا جاتا ہے۔ ان کے پاؤں میں ڈوری باندھی جاتی ہے۔ شکاری ڈوری کا سرا اس خس پوش دیوار کے سوراخ سے باہر نکال کر اسے ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔ جب کلنگوں کی کوئی ڈار تالاب پر سے گذرتی ہے تو شکاری اس ڈوری کو کھینچتا ہے۔ کلنگ رشتہ بہ پا اچھلنے اور کودنے لگتا ہے۔ اور آوازیں نکالتا ہے۔ اوپر اڑنے والے کلنگ اپنے بھائی کو تالاب کے کنارے دیکھ کر نیچے اتر آتے ہیں۔ اور شکاری کے

پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔

بقول شاعر

عقاب

گویند کہ یک روز قوی بال عقابے
از قلۂ کوہے بپرید و بہوا خاست
براوج فلک رفتہ بگفتا بہ دل خویش
امروز ہمہ ملک جہان زیر پر ماست
ناگاہ زکمین گاہ یکے سخت کمانے
تیرے بہ زہ آورد و قضا بردہ بہ او راست
زین حادثہ صعب فرو ماند بہ حیرت
کین آہن و این چوب ندانم زکجا خاست
چوں نیک نظر کرد در و دیدہ پر خویش
گفتا زکہ نالیم کہ از ماست کہ بر ماست

بغرہ قرہ. سیاہ سینہ. گنجشک صحرائی اور مرغابی کے شکار کے لئے کوہستان کے لوگ گھوڑے کی دم کے بالوں سے پھندے بنتے ہیں۔ اس پھندے کے حلقوں کو باہم ایک مضبوط رشتے میں باندھ کر اسے زمین میں لکڑی کی میخ ٹھونک کر باندھ لیتے ہیں۔ جب پرندے زمین پر اُتر کر دانہ چگنے میں مشغول ہوتے ہیں. ان کی گردنیں ان حلقوں میں پھنس جاتی ہیں۔ اب جس قدر پرندے زیادہ تڑپتے ہیں اُسی قدر یہ حلقے سخت ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ صیاد کے دام میں گرفتار ہوتے ہیں۔ بقول شاعر۔

اے دل اندر بند زلفش از گرفتاری منال ؛
مرغ زیرک چون بدام افتد تحمل بایدش ؛

سردیوں کے موسم میں جب زمین برف سے سفید ہوتی ہے بعض لوگ گدھے پر راکھ کی بوری لاد کر۔ قریہ سے باہر اسے زمین پر چھڑک دیتے ہیں۔ جس سے زمین کا ایک ٹکڑا سیاہ ہو جاتا ہے۔ اب اسی پھندے کو جو گھوڑے کی دم کے بالوں سے تیار کرتے ہیں اس جگہ بچھا کر کچھ دانے اس پر بکھیر دیتے ہیں

بھو کا پرندہ دانے چگنے آتا ہے اور پھندے میں پھنس جاتا ہے ؎ ہر کس کہ دانہ چید گرفتار دام شُد .

جو جانور ہوشیار ہوتا ہے وہ اس فریب کو سمجھکر دور ہی سے بھاگ جاتا ہے ۔

زرہم میفگن اے شیخ تو دانہ ہائے تسبیح
کہ چو مرغ زیرک افتد - نہ فتد بہیچ دامے

ہمارے ملک کوہستان میں کنجشک صحرائی کو سینکڑوں کی تعداد میں ذبح کر کے ہڈیوں سمیت بھون لیتے ہیں ۔ یہ حد درجہ مقوی اور لذیذ غذا ہوتی ہے موسم سرما کے چھ مہینوں میں جبکہ زمین برف سے سفید ہوتی ہے اور موسم سرد - یہاں کے لوگ یہی گوشت کھاتے اور آرام و استراحت سے صندلیوں میں دن گذارتے ہیں ۔ سوائے اس کے - نہ ان کے لئے کوئی کام ہوتا ہے - نہ یہ لوگ کوئی کام کر سکتے ہیں -

یہ لوگ اپنی خوراک کے لئے سردیوں کے آغاز میں موٹے اور تازے دنبے ذبح کر کے اسکی پشم اتار لیتے ہیں ۔ پھر ان کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہینگ اور نمک لگا کر اسے خشک کرتے ہیں ۔

جسے "گوشت قاق" کہتے ہیں۔ شلجم، مولی، گاجر۔ اور آلو وغیرہ کو دو گز زمین کھود کر اس گڑھے میں گاڑ دیتے ہیں۔ چونکہ موسم سرما میں سبزی اور ترکاری نہیں مل سکتی لوگ انہی اشیا کو آہستہ آہستہ نکال کر پکاتے ہیں۔ گھوڑے گائے۔ بیل اور دیگر مویشیوں کے لئے گندم کے بھوسے اور رشقے کو سکھا کر حسب ضرورت استعمال کرتے ہیں موسم سرما میں جب کہ دریاؤں اور نالوں کا پانی جم جاتا ہے۔ لوگ برف کو بڑی دیگوں میں بھر کر انکے نیچے آگ جلاتے ہیں جب یہ برف پگھلتی ہے تو اسی پانی کو پینے۔ کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کے مصرف میں لاتے ہیں۔ کوہستان میں سردرختی میووں اور انگور کی افراط ہے۔ میں جب ایک مدت مدید کے بعد وہاں پہنچا تو یہ چیزیں وہاں زیادہ وافر ہو گئی تھیں یہاں کا خربوزہ۔ سیب۔ ناک خومانی اور انگور کابل سے پاکستان اور ہندوستان تک برآمد ہوتا ہے۔ تازہ انگور بھی کثرت سے فروخت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ متمول اور فارغ البال ہو گئے ہیں۔ اگر متعصب ملا اسکی اجازت دیں کہ حکومت افغانستان کسی انگریزی کمپنی کو اس انگور سے شراب کشید کرنے کا ٹھیکہ دیدے اور وہ کمپنی اس شراب کو خارجہ ممالک میں

بھیجدے تو اس کا کثیر منافع ملک میں رہ کر اس کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے ، بقول شیخ سعدی شیرازی ۔

گر آب چاہ نصرانی نہ پاک است

جہود مردہ مے شوئید چہ باک است

خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسلامی ممالک میں مسلمانوں پر تو شراب بند تھی مگر غیر مسلم رعایا کے لوگ شراب بناتے بھی تھے اور پیتے بھی تھے۔ اور یہی رسم دیگر مسلمان بادشاہوں کے زمانوں میں بھی جاری رہی ۔

جبکہ موجودہ زمانے میں ۔ بہ تقاضائے وقت و مصلحت زمانہ علمائے اسلام نے سود کو جائز ٹھہرایا ہے کہ ہم اپنا روپیہ بنک میں رکھکر اس کا منافع حاصل کر سکتے ہیں گھر اور زمین کو رہن رکھکر اپنے مسلمان بھائی سے ایک فیصدی یا اس سے زیادہ شرح پر نفع کما سکتے ہیں تو اس صورت میں ہمارے ملک میں پیدا ہونیوالے انگور کا پانی اگر خارجہ ممالک میں جا کر مملکت کیلئے باعث نفع ہو تو اس سے نقصان کیا ہے ؟

حالات حاضرہ اور مقتضیات زمانہ کے پیش نظر جو کچھ میں آج کہتا ہوں کل ہو کر رہیگا ۔ مگر افسوس ہے کہ ہم وقت کی قدر نہیں کرتے ، اور اسے بیکار ضائع کرتے ہیں ۔ اے زفرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش ۔

مغربی ممالک سے اسلامی ملکوں میں انہی حرام مشروبات کی درآمد ہوتی ہے جن کے لئے خارجہ تجار بھاری بھاری قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ یہ منافع خارجہ کفار کی جیبوں میں بھی جاتا ہے اور اسلامی ممالک میں بھی اس سے کثیر نفع کماتے ہیں۔ مگر ملّاؤں کی نگاہ میں یہ گناہ نہیں۔ بلکہ وہ اپنی شکم پروری کیلئے انہی حکومتوں سے تنخواہ اور امداد حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

سود و ریا و غیبت مال یتیم و وقف
ایں جملہ شد حلال مگر مے حرام شد

یہ حضرات انگریزی دوائیاں جن میں اکثر و بیشتر شراب کی آمیزش ہوتی ہے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ حکم یہ ہے کہ حرام میں شفا نہیں۔ میں ہمیشہ دیکھتا ہوں کہ یہ حضرات باایں ہمہ ریش و فش ایک چھوٹی شیشی ہاتھ میں لئے دکانوں میں پھرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں میری بیوی بیمار ہے تھوڑی سی برانڈی چاہیئے۔

لطیفہ۔ دلیل شرعی

ایک اسلامی ملک میں ایک ہندو نے ہوٹل تعمیر کیا ہے۔ ہوٹل

کا ٹھیکہ دار مسلمان ہے ہوٹل میں شراب بیچنے اور شراب پلانے والا بھی مسلمان ہے۔ نماز گذار فربہ اندام اور لمبی داڑھی والا۔ ایک دن میں نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اس شراب فروش سے پوچھو کہ شرع میں شراب پینا اور شراب بیچنا دونوں ممنوع ہیں۔ تو اس اسلامی لبادہ لمبی داڑھی اور عمامہ و دستار کے ساتھ اس حرام چیز کے بیچنے کا کیوں مرتکب ہوا ہے۔ حضرت نے جواب دیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے گناہ گار ہے تو ٹھیکہ دار۔ میں نے اسکے قریب ہو کر کہا۔ بھائی صاحب ٹھیکہ دار مسلمان ہے وہ کیوں گناہ گار ہونے لگا گناہ گار ہے تو وہ ہندو جس کا یہ ہوٹل ہے۔ اگر وہ کافر لعین یہ ہوٹل نہ بناتا تو ٹھیکہ دار شراب کا ٹھیکہ لیتا نہ تم شراب بیچتے۔ حضرت بہت خوش ہوئے اور کہا خدا کی قسم آپ نے سچ کہا۔ حقیقی گناہ گار وہی لعین ہندو ہے۔ ہم الحمد للہ مسلمان ہیں۔ خدا ہمیں گناہ سے بچائے۔ میں نے ہنسکر کہا آفرین۔ شاباش اسی کو کہتے ہیں حیلہ شرعی۔

نہ بے حکم شرع آب خوردن خطا است
دگر خون بہ فتویٰ بریزی روا است

اسی طرح اور چیزوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔

ان باتوں سے قطع نظر کر کے اس ہنگامے کو بھی دیکھیں کہ ان دنوں ملک بھر میں بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی کا کتنا زور ہے۔ دشمنان ملک و ملت نہیں بلکہ دشمنان انسانیت۔ اشیاء ضروری کو چور بازار میں منتقل کر کے ان پر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام اور مضر اشیاء کی ملاوٹ کر کے لوگوں کی صحتوں کو برباد کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ یہ لوگ دوائیوں میں بھی ملاوٹ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اس فعل شنیع سے کتنے مسلمان مریضوں اور معصوم بچوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مگر ہمارے موجودہ مُلّا صاحبان ان غیر اسلامی حرکات کے خلاف آواز تک بلند نہیں کرتے کہ اے مسلمانو! ان باتوں سے اجتناب کرو۔ افسوس ہے ہماری مسلمانی پر۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ بابان داریم
وائے اگر در پس امروز بود فردائے

برخیز تا یک سو نہیم۔ این دلق ازرق فام را
بر باد قلاشی کنیم۔ این شرکِ تقویٰ نام را

اسلامی اخبارات و جرائد میں اکثر سنا جاتا ہے کہ ایک دکاندار اپنے بیٹے سے کہتا ہے۔ بیٹا! آٹے میں مٹی اور ریت ملا دی ہے؟ بیٹا کہتا ہے۔ جی ہاں ملا چکا ہوں۔ باپ پوچھتا ہے۔ ہلدی میں بھی زرد مٹی کا رنگ ملا دیا ہے۔ بیٹا جواب دیتا ہے جی ابا جان ملا چکا ہوں۔ پھر پوچھتا ہے گھی میں بھی چربی اور آلو کی ملاوٹ ہو گئی ہے بیٹا کہتا ہے۔ جی ہاں ہو گئی ہے۔ تب باپ کہتا ہے شاباش بیٹا۔ اب جلد جلد وضو کرو کہ نماز باجماعت قضا نہ ہو جائے۔

کسی اہل دل نے سچ کہا ہے کہ۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند۔ حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے

قرآن کنند حفظ و بہ طاہا کشند تیغ
یٰسین کنند وِرد و امام مبین کشند

ایکدن بھی یہ بات سننے میں نہیں آئی کہ کوئی مُلّا یہ کہے کہ لوگو! مخلوق خدا پر ظلم کر کے عوام کو بلیک مارکٹ اور ذخیرہ اندوزی کی بلائیں مبتلا کرنا اور او عائے نماز کرنا۔ بے سود ہے

نکل جاتی ہے سچی بات جسکے منہ سے مستی میں ؛ فقیہہ مصلحت بین سے وہ رند بادہ خوار اچھا

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

تازیانہ عبرت

ایکدن ریل کے سفر کے دوران میں ایک پادری میرا ہمسفر تھا اسنے مجھ سے کہا کہ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہو تو وقت کاٹنے کے لئے کچھ مذہبی بات چیت کرلیں میں نے کہا بسم اللہ اس میں کیا مضائقہ ہے اسنے کہا ایک بات پوچھتا ہوں آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں نے کہا ناراض ہونے کی کیا بات ہے اگر سوال معقول ہوا تو اس کا جواب دیدونگا۔ اسنے کہا کہ آپ کے قرآن کا دعوےٰ صحیح نہیں ہے۔ میں نے کہا کونسا دعوےٰ ہے؟ اور کس دلیل سے؟ اس نے کہا قرآن میں لکھا ہے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

یعنی نماز بے حیائی کی باتوں اور بدکاریوں سے روکتی ہے۔ میں نے کہا درست کہا ہے۔ اس نے کہا۔ نماز پڑھنے کے باوجود مسلمان فواحش سے باز نہیں آتے۔ اور ان کی اصلاح نہیں ہوتی۔ میں نے جواب دیا کہ ہماری نمازوں میں وہ خشوع وخضوع نہیں جو نماز کی اصل روح

ہے۔ اگر مسلمانوں میں یہ روح پیدا ہو جائے تو یقیناً وہ فواحش سے پرہیز کریں گے۔ اس نے ہنس کر کہا کہ پھر ایسی نماز سے کیا حاصل کہ تم لوگ خود اپنے قرآن کے حکم کو جھٹلاتے ہو۔ اگر نماز نہ پڑھتے تو یہ کہہ سکتے تھے کہ افسوس ہم نماز نہیں پڑھتے۔ ورنہ بری باتوں سے دور رہتے

میرے پاس اس کا کوئی جواب باصواب نہیں تھا۔ خاموش رہ گیا اب اگر کسی ملا صاحب کے پاس اس کا جواب ہو تو ارشاد فرمائیں۔

اسلام میں پہلی شرط ہے وحدانیت اور عقیدہ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھی سے امداد و استعانت طلب کرتے ہیں۔ یہی ہے پیروی قرآن سے

مرادا ست ز کبریا د منی   کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

دوم اتباع سنت رسول علیہ السلام جو افضل ترین انبیاء اور خاتم المرسلین ہیں۔ آپ ہی کی شانِ گرامی کے بارے میں کہا گیا ہے

ملک در سجدۂ آدم زمین بوس تو نیت کرد
کہ در ذاتِ تو چیزے دید بالاتر ز انسانی

اب ہماری یہ حالت ہے کہ

ہمچو من نالائقے در صلب انسان دیدہ بود
زاں سبب ابلیس ملعون سجدہ بر آدم نہ کرد

مطابق حکم قرآن مجید۔ مسلمانوں پر تین بیعتیں واجب ہیں۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ یعنی

بیعت واطاعت خدا۔ بیعت رسول۔ اور بیعت اولی الامر۔ مگر مسلمانوں

نے اور بہت سی بیعتیں اپنے اوپر لازم قرار دی ہیں۔ وہ اپنے پیروں کو

مشکلکشا سمجھ کر اپنی حاجتیں ان سے مانگتے ہیں۔ پیر صاحب بھی

خدا اور رسول کے احکام کے خلاف اپنے مریدوں سے ہر سال

نذرانے اور شکرانے قبول کرتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

بدام پیر و مُلاّ تو اسیری ٭ حیات از حکمت قرآن نہ گیری

بہ آیاتش ترا کارے این جز نیست ٭ کہ از یٰسین آن آسان بمیری۔

مُلاّ صاحبان ممبر رسول پر بیٹھکر اپنی قوم کے افراد سے یہ نہیں کہتے کہ

سُود کے بارے میں حکم الٰہی یہ ہے کہ جو شخص سود کا لین دین کرتا ہے اسے

چاہیئے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کر دے

فأذنوا بحرب من اللہ ورسولہ

جھوٹے پر قرآن مجید میں لعنت وارد ہوئی ہے۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین

غیبت کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ غیبت کرنے والا اپنے مردہ بھائی

کا گوشت کھاتا ہے۔ یاکل لحم اخیہ میتا۔

مردہ جانور۔ بہتا ہوا خون۔ خنزیر کے گوشت اور ان جانوروں کے گوشت کے بارے میں جو اللہ کے بغیر دوسروں کے نام پہ ذبح کئے گئے ہوں قرآنی حکم یہ ہے کہ وہ مسلمانوں پر حرام ہیں۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ

اسی طرح جوئے کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ یہ شیطان کا بدترین عمل ہے اس سے اجتناب لازم ہے

رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ

مگر رمضان کے مہینے میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان روزہ رکھکر بھی تمام دن جوئے بازی میں مشغول رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں بھئی ہم تو روزے کو بہلاتے ہیں تاکہ وقت جلدی گذر جائے۔ اور روزے کی زحمت معلوم نہو۔ سچ ہے ؎

بر دہان تسبیح و در دل گاؤ خر۔ ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

ان بدعات کی اصل وجہ کیا ہے؟ یہی کہ ہمارے ظاہر دار پیر اور بے عمل علماء اپنے مریدوں اور معتقدوں کو احکام خدا اور رسول

سے آگاہ نہیں کرتے۔

شراب کی حرمت کے بارے میں کوئی قطعی حکم قرآن میں وارد نہیں ہوا۔ بلکہ کہا گیا ہے کہ اس سے اجتناب لازم ہے۔ کیونکہ یہ شیطانی عمل ہے۔ اس میں فائدے بھی ہیں۔ مگر اسکی مضرت فائدوں کے مقابلے میں زیادہ ہے،

فیہِ منافعَ للنّاس۔ واثمہما اکبر من نفعہما۔

ہمیں یہ امر قبول ہے کہ شراب بری چیز ہے۔ مگر نہ اسقدر کہ اگر ایک غیر مسلم خارجہ کمپنی اسے ملک سے باہر لے جاکر غیر مسلموں پر فروخت کرے اور اس کا منافعہ ہمارے ملک کو پہنچے تو یہ بھی حرام قطعی ہے

ایک تازہ نقل

پیر پرستی اور قبر پرستی کے بارے میں بھی میں نے بہت سی ایسی باتیں سنی اور دیکھی ہیں جو شرک پر تمام ہوتی ہیں۔ ایک تازہ نقل سُنیئے:۔

میں نے یہ نقل ہائی کورٹ کے ایک جج سے سنی ہے جو اس

وقت حکومت آزاد کشمیر میں ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ گذشتہ سال سرکٹ ہاؤس ایبٹ آباد میں اسنے بیان کیا۔ کہ میں گوجر خان کے دورہ پر گیا ہوا تھا۔ جمعہ کے دن میں نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں گیا تو جناب پیش امام صاحب نے خطبہ کے بعد جو عربی زبان میں تھا اور جسے کوئی مقتدی سمجھ نہیں سکتا تھا، پیروں کی تعریف میں اپنی مقامی بولی میں فرمایا۔ کہ ایک عورت نے ایک باکمال پیر روشن ضمیر کی خدمت میں حاضر ہو کر بحد درجہ گریہ وزاری کے ساتھ عرض کیا کہ آپ دعا کریں کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہو۔ پیر صاحب نے کہا کہ تم اس گاؤں میں اور ایسی عورتوں کی تلاش بھی کرو جو بچے کی خواہشمند ہوں تاکہ سب کے لئے دعا کروں۔ وہ عورت دو دن کے بعد پانچ عورتوں کو ساتھ لے کر آئی۔ کہ ان کے ہاں فرزند پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے لئے دعا کریں کہ یہ صاحب اولاد ہو جائیں پیر صاحب نے فرمایا دہی کا ایک کونڈہ لے آؤ۔ کونڈہ حاضر کیا گیا، تو حضرت نے اخ تھو کر کے کونڈے میں تھوک دیا

پھر اس تھوک کو تمام دہی میں آمیز کر کے تھوڑی تھوڑی دہی ہر ایک عورت کی ہتھیلی پر رکھدی کہ اسے چاٹ لے۔ سب نے وہ دہی نوش جان کر کے رخصت مانگی۔ مدت موعود کے بعد ان سب کے ہاں بچے پیدا ہوئے وہ اپنے بچے لے کر پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور نذر نذرانے پیش کئے۔ صرف ایک عورت کے ہاں بچہ تولد نہیں ہوا تھا۔ پیر صاحب نے قہر و جلال میں آکر کہا۔ سچ سچ کہو کیا بات ہے یہ ممکن نہیں کہ کوئی عورت میرا لعاب دہن مبارک کھائے اور صاحب اولاد نہو۔ بتاؤ تم نے کیا کیا، وہ عورت بے چاری ڈرتے ڈرتے بولی حضور۔ جس دہی میں آپ نے تھوک دیا تھا۔ میرے دل نے اسے گوارہ نہیں کیا کہ میں اس کو حلق سے نیچے اتارلوں۔ جب میں آپ کے حضور سے رخصت ہو کر باہر نکل آئی تو اس دہی کو جو میں نے منہ میں رکھا تھا فلاں پتھر پر تھوک دیا،

پیر صاحب ان عورتوں اور اپنے دیگر معتقدین کو ساتھ لیکر اس پتھر کے پاس انہیں لیگئے۔ دیکھا تو پتھر کے نیچے ایک بچہ

پڑا ہوا تھا، جو بھوک اور پیاس کی وجہ سے مر گیا تھا۔

پیش امام صاحب نے یہ حکایت بیان کر کے کہا۔ کہ لوگو! پیروں میں اتنی طاقت اور قدرت ہے کہ وہ پتھر سے بھی بچہ پیدا کر سکتے ہیں۔ سب ملکر نعرہ لگاؤ کہ "پیر صاحب زندہ باد" سب مقتدیوں نے کہا "پیر صاحب زندہ باد"

اب دیکھئے ملا صاحبان۔ میّت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میت کے لئے حلوہ پکا کر فاتحہ دینا خیرات کرنا۔ نقد و جنس اور اسقاط بانٹنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے۔ مگر ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ خیرات و صدقات وغیرہ غریبوں، فقیروں اور مستحقوں میں تقسیم نہ کئے جائیں۔ بلکہ بے علم و بے عمل ملاؤں اور پیروں کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔

کسی شاعر نے کہا ہے

گر بدست خود دہی خرمائے تر

بہ کہ بعد از تو دہند خروار زر

میّت کی بخشش اور نجات کے لئے اعمال صالح کی ضرورت ہے نہ کہ ملّاؤں اور پیروں کی خدمت میں نذرانہ اور رشوت پیش کرنے کی

پچھلے دنوں جبکہ میں دہلی میں مقیم تھا۔ جامع مسجد شاہجہان کی تولیت ایک ایسے شخص کے سپرد تھی جو اس مسجد کا پیش امام بھی تھا۔ صاحبقرآن شاہجہان نے یہ مسجد تعمیر کر کے بہت سی دکانیں اور دیگر جائیدادیں اس کے لئے وقف کی تھیں۔ جن کی تمام آمدنی متولی مذکورہ کے پیٹ میں چلی جاتی تھی۔ دیگر علمائے کرام اور ائمہ عظام کی بھی اس مال حلال پر نگاہ تھی، انہوں نے متولی مذکور سے کہا کہ اس کثیر آمدنی میں سے انہیں بھی حصّہ دار بنایا جائے، مگر متولی صاحب نے کوئی پرواہ نہیں کی، یہاں تک کہ یہ مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا، مقدمے کے دوران میں ایسے قبالوں کی نقلیں بھی پیش ہوئیں جن میں متولی صاحب نے بعض حاجتمند مسلمانوں کو ایک فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ شرح پر سودی قرضہ دیا تھا۔ اس متولی کا نام مجھے معلوم ہے مگر تحریر نہیں کرتا۔ بقول اُنکہ

بہ این لباس کسے کاشناست می داند
کہ پوششے نہ بود بہتر از خطا پوشی

انہیں مُلّاؤں کے افعال شنیعہ کے بارے میں حضرت حافظ شیراز فرماتے ہیں۔

فقیہ میکدہ۔ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

اسی باب میں حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں

صاحبدلے بہ مدرسہ آمد ز خانقاہ
بشکست عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود!
تا اختیار کردی از و ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر مے برد ز موج
وین جہد مے کند کہ بگیرد غریق را

مُلّاؤں اور عالموں کو چاہیئے کہ وہ ملت اسلامیہ کے ناواقف اور ناسمجھ افراد کی دستگیری کر کے انہیں نجات کا راستہ بتائیں۔

نہ یہ کہ انہیں پیر پرستی کی تعلیم دیکر۔ خدا پرستی کی راہ سے ہٹائیں
خدائے کائنات اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا.

یعنی خدائے پاک کا نام یاد کرکے۔ اسی کے اور صرف اسی کے ہور ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے،

لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا

یعنی عبادت کے لائق صرف خدائے پاک ہے تم اسی کو اپنا حقیقی کارساز سمجھو۔ مگر پیران جاہل اور شیخان گمراہ ہمیں آستانہ خداوندی سے دور ہٹا کر اپنی چوکھٹوں پر سجدہ ریز کرتے ہیں

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بھنگ و پوست کی کاشت۔ اور چرس وافیون جن کا استعمال اور نشہ انسانی عقل و دماغ کے لئے زہر قاتل ہے، کی فروخت تو جائز ہے۔ مگر انگور وغیرہ کے پانی سے شراب تیار کر کے اسے بیرونی ممالک کے غیر اسلامی لوگوں کے ہاتھ فروخت کر کے ملک و ملت کے لئے بے حد نفع کمانے کی صورت پیدا کی جائے تو وہ

ناجائز۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ یہ کہاں کی عقل مندی ہے۔ ؎ براین عقل و دانش بباید گریست۔

ہمارے ملک میں۔ انگور کے پانی کو ابال کر اس سے شیرہ تیار کرتے ہیں۔ یہ شیرہ صدیوں سے یہاں کے غریب طبقہ میں حلوہ وغیرہ میٹھی چیزیں تیار کرنے میں قند اور شکر کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ بے عقل ملاؤں نے اسے بھی حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ انگور کے پانی سے تیار ہوتا ہے، ممکن ہے یہ لوگ گڑ اور شکر کو بھی یہ کہکر حرام ٹھہرائیں کہ یہ دونوں چیزیں بھی گنے کے رس سے تیار ہوتی ہیں۔ اگر گنے کے رس کو بھی سڑنے تک چھوڑ دیں تو اس سے بھی شراب بنتی ہے، مالٹا، سنترہ اور لیمو وغیرہ کا رس بھی شراب بن سکتا ہے، جیسے کہ کھجور کے رس سے شراب بن کر نبیذ کہلاتی ہے جس میں شراب کا سا نشہ ہوتا ہے

ہر ساعت از تو قبلہ با بت پرستی مے رود
توحید بر ما عرضہ کن تا بشکنیم اصنام را

کجا بود مطلب، کجا تا ختم،

ذکر ہو رہا تھا کوہستان کے انگور سے شراب تیار کرنے کا اور میں موجودہ زمانہ کے پیروں اور ملاؤں کے پیچھے پڑ گیا، یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کی صحبت ان کے پیروؤں کے لئے مفید ہے، مگر وہ بھی اس صورت میں کہ یہ صالح لوگ زندہ ہوں نہ کہ مردہ۔ نیکوں کی صحبت انسان کو نیک کر دیتی ہے۔ عوام ان کی نصیحتوں اور ان کے اسوہ حسنہ اور اخلاق حمیدہ سے سبق حاصل کر کے اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔

صحبت صالح ترا صالح کند ٭ صحبت طالح ترا طالح کند

نیک صحبت۔ نیک کر دیگی تجھے

بد بُروں میں ایک کر دے گی تجھے

فارسی کے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے،

بہ عنبر فروشاں اگر بگذری ٭ شود جامۂ تو ہمہ عنبری

اگر تو شوی نزد انگشت گر ٭ از و جز سیاہی نیابی دگر

اگر کوئی کسی صالح آدمی کے پاس جائے تو وہ اس سے یہ نہیں کہتا

کہ میری بیعت اختیار کر کے میرے مرید بن جاؤ۔ بلکہ وہ کہیگا کہ اگر تو مجھے نیک اور صالح سمجھتا ہے تو عامل قرآن بن جاؤ کیونکہ میں بھی خدا کا ایک عاجز بندہ ہوں یہ مرتبہ مجھے اتباع قرآن مجید کی برکت سے عطا ہوا ہے۔ تو بھی اگر نیک بننا چاہتا ہے تو قرآن مجید کا دامن مضبوطی سے تھام لے، بقول علامہ اقبال

گر تو مے خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

حکایت حضرت ذالنون مصریؒ

اسی سلسلہ میں حضرت شیخ سعدیؒ نے بوستان میں تمثیلاً یہ حکایت درج کی ہے:-

چنیں یاد دارم کہ سقائے نیل ۞ نکرد آب بر مصر سالے سبیل
گروہے سوئے کوہساران شدند ۞ بفریاد خواہان باران شدند
گرستند از گریہ جوئے روان ۞ نیامد مگر گریہ آسمان
بہ ذالنون خبر برد زیشان کسے ۞ کہ بر خلق رنجست و سختی بسے

فرو ماندگان را دعائے بکن ؛ کہ مقبول را رد نباشد سخن

شنیدم کہ ذوالنون بہ مدین گریخت ؛ بسے بر نیامد کہ باران بریخت

خبر شد بہ مدین پس از روز بیست ؛ کہ ابر سیہ دل بر ایشان گریست

سبک عزم باز آمدن کرد پیر ؛ کہ پُر شد ز سیل بہاران غدیر

بپرسید از و عارفے در نہفت ؛ چہ حکمت درین رفتنت بود گفت

شنیدم کہ بر مرغ و مور و دوان ؛ شود تنگ روزی ز فعل بدان

درین کشور اندیشہ کردم بسے ؛ پریشان تر از خود ندیدم کسے

برفتم مبادا کہ از شر من ؟ ؛ بہ بندد در خیر بر انجمن ؟

بہی بایدت لطف کن کان مہان ؛ ندیدندے از خود بتر در جہان

تو آنگہ شوی پیش مردم عزیز ؛ کہ مر خویشتن را نگیری بہ چیز

بزرگے کہ خود را بہ خوردی شمرد ؛ بہ دنیا و عقبیٰ بزرگی ببرد

در این خاکدان بندہ پاک شد

کہ در پائے کمتر کسے خاک شد

درسِ بصیرت!

مجھے پہلے بھی خبر تھی۔ اور اب سیاحت افغانستان کے دوران میں اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ کہ جن دنوں حبیب اللہ ثانی المشہور بہ بچہ سقّہ کابل کے ارک شاہی میں محصور تھا۔ اور فیلڈ مارشل والاحضرت سردار شاہ ولی خان نے کابل کے پہاڑوں پر توپیں نصب کر کے ارک پر گولہ باری شروع کی تو کسی نے موصوف سے کہا کہ آپکے خاندان کے افراد ارک میں دشمن کے پنجے میں گرفتار ہیں کہیں اس گولہ باری سے انہیں نقصان نہ پہنچے، یا دشمن انہیں آپ کے گولوں کی زد میں کھڑا نہ کردے اس لئے مناسب یہی ہے کہ گولہ باری بند کر یجائے، سردار موصوف نے جواب دیا کہ وطن مقدس کی آزادی کی راہ میں میرے خاندان کے ہزاروں افراد قربان ہو جائیں تو بھی مجھے پرواہ نہیں، کیونکہ وطن کی نجات سب سے زیادہ مقدم ہے۔ اسی جذبہ فداکاری کی برکت سے۔ خدا نے سردار صاحب کو فتح بھی عطا کی

اور آپ کا خاندان بھی محفوظ رہا۔ ؎

عروس فتح کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند!

دوسری طرف۔ ہم وطن کے اس غیور سپاہی کی خدمت میں
بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں جسے بچہ سقہ کہا جاتا ہے کہ اس
نے اپنی حکومت کے دوران میں جبکہ اعلیحضرت شہید کے
خاندان کے افراد اس کی قید میں تھے ان کی خواتین محترم
کو اپنی مائیں اور بہنیں سمجھکر ان کا احترام کیا۔ اور کسی قسم کی سختی یا
بے حرمتی ان پر روا نہیں رکھی۔ یہ دونوں واقعات ہمارے
لئے باعث فخر ہیں۔ بالخصوص کوہستان کے باشندوں
کے لئے کہتے ہیں کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا ایک جرنیل افضل خان
دکن میں سیواجی مرہٹے کے ساتھ مصروف جنگ تھا چند ضروری
امور کے متعلق اس نے اورنگ زیب سے مشورہ طلب کیا شہنشاہ
نے اسے جواب میں لکھا کہ محاذ جنگ سے سینکڑوں میل دور رہ کر میں
تجھ کو کیا مشورہ۔ دے سکتا ہوں تو خود جو مناسب سمجھے



حبیب اللہ ثانی المعروف بہ بچہ سقہ شاہی لباس میں

اسی پر عمل کر۔ آخر میں یہ فرد تحریر کیا۔

من نہ می گویم سمندر باش یا پروانہ باش
چوں بہ فکر سوختن افتادہ مردانہ باش

مشہور ہے کہ سمندر ایک پرندہ کا نام ہے جو نغمہ سرائی کرتے کرتے مست ہو جاتا ہے اور اس کے جسم سے آگ نکلتی ہے جس میں خود ہی جل جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

سردار شاہ ولی خان نے اسی فرد کی پیروی کر کے مردانہ وار میدان ہمت میں قدم رکھا۔ اور کامیاب و کامگار ہو گیا۔

اس کے مقابلہ میں انہی دنوں بغداد میں عرب قوم نے جس جہالت غیر اسلامی رویہ اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ اسکی مثل و نظیر نہ انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے نہ شریعت مطہرہ مصطفوی میں۔ سچ پوچھیئے تو اس سے سانحہ کربلا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جس میں اہلبیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے تھے۔ بلکہ یہ ظلم اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ میدان کربلا میں جب تک اخوان و انصار حسینؓ شجاعت و شہامت کے جوہر

دکھاتے ہوئے مصروف جنگ رہے۔ ابن زیاد اور شمر کے لشکریوں نے بھی ان کا مقابلہ کیا۔ مگر شہادت امام ہمام حسین علیہ السلام کے بعد سراپردگیان حریم رسول مقبولؐ اور حضرت زین العابدین بیمار کو دربار دمشق میں پہنچا دیا گیا۔ یزید نے بھی اپنے کیے پر پشیمان ہو کر انہیں عزت و آبرو کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا۔ اور ان کے آرام و استراحت کے تمام سامان بہم پہنچائے۔ مگر بغداد کے بدبخت لوگوں نے یہ بھی نہیں کیا۔ انہوں نے بادشاہ و وزیر کو قتل کیا تھا تو کیا تھا، ان کی لاشوں کی بیحرمتی اور خاندان رسول کی تباہی کے بارے میں ان کے پاس کونسی دلیل تھی؟ بہتر تو یہی تھا کہ ان بیگناہوں کو بغداد سے خارج البلد کر کے ترکیہ۔ افریقہ یا کسی اور ملک میں بھیجدیا جاتا جسطرح مصر کے لوگوں نے شاہ فاروق اور اس کے خاندان سے سلوک کیا تھا۔

بغداد کے لوگوں کا یہ فعل شنیع ان کے چہروں پر کلنک کا داغ ہے جو اسوقت تک قائم رہیگا جبکہ کوئی چنگیز آکر ان سے انتقام

نہیں لیگا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اننداٗیں ایک خدا۔ ایک دین ایک رسول۔ اور ایک قرآن تھا۔ خود غرض پیروں اور ملاؤں نے اپنے ذاتی فائدے کے لئے مسلمانوں کی جمعیت کو پارہ پارہ کر کے انہیں شیعہ سنی۔ وہابی یا قادری۔ نقشبندی چشتی اور سہروردی وغیرہ فرقوں میں تبدیل کر دیا۔

بقول شاعر:

ہفتاد و دو فریق جد کی عدو سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

کسی فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

چونکہ پیران نزد دنیا باختند
دین حق را پارہ پارہ ساختند

حضرت فریدالدین عطار نے اس بارہ میں لکھا ہے۔

زنادانی۔ دل پر جہل در پرمکر ٭ گرفتار علی ماندی و بوبکر
تمام عمر ازان ماچوں نہ رستی ٭ نہ مے دانم خدا را کے پرستی۔

اب جمہوریت کے بارے میں چند باتیں تحریر کرتا ہوں

کتاب "نورکہستان" میں جمہوریت کے متعلق میں نے کچھ لکھا تھا۔ مگر اس کے نقائص بالتفصیل بیان نہیں کئے تھے۔ اب ایک دو سالوں کے بعد جب یہ نقائص حد تصدیق تک پہنچے تو اس ضمن میں بھی میں تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اگر پاکستان میں موجودہ جمہوریت کا دور برقرار رہا تو اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے

ہمارے ملک کا انتظام ہزاروں سال سے شخصی حکومت کے تحت ہر کروٹ کیساتھ چل رہا تھا چنانچہ ظہور اسلام کے بعد خدائے کائنات نے مسلمانوں کے لئے یہ صریح حکم نازل فرمایا کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ یعنی خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد ایک امیر کی اطاعت تم پر لازم ہے۔ نہ کہ سینکڑوں امرا کی اطاعت اور فرمانبرداری۔

موجودہ جمہوریت انگریزوں کی اختراع ہے۔ ان کی فطرت

اور طبیعت نیز ان کا ماحول جدا ہے جمہوری حکومت ممکن ہے ان کے لئے مفید ہو مگر ہمارے موافق نہیں۔

لندن میں جب انتخابات شروع ہوتے ہیں تو ہر فرد ملت کو اپنے ووٹ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، وہ جانتے ہیں کہ ہمیں اس شخص کو ووٹ دینا ہے جو ملک اور قوم کے لئے مفید ہو۔ جو قابل دیانتدار اور بہی خواہ قوم ہو۔ وہ کسی تحریص یا ترغیب کے بغیر اپنا ووٹ اپنے حقیقی نمائندے کے بیلٹ میں ڈال کر اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو امیدوار منتخب ہو جاتا ہے وہ اپنے فرائض منصبی سے بالکل آگاہ ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے حلقہ نیابت کے لوگوں کی کیا کیا ضروریات ہیں۔ وہ ان ضروریات کو پورا کرنے اور ان لوگوں کو آرام پہنچانے کے لئے کونسل میں بہترین تجاویز پیش کر کے ان کی تکمیل کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔ مثلاً۔ پانی۔ بجلی یا غلہ۔ لباس اور دیگر ضروریات زندگی کی بہم رسانی وغیرہ۔

وہاں یہ طریقہ رائج نہیں کہ کوئی ووٹر اپنے امیدوار کے

پاس جاکر اسے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کیلئے مجبور کرے ہمارے ملک میں جب انتخابات شروع ہوتے ہیں تو ووٹروں کے لئے روپیہ حاصل کرنے کے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اس فکر میں ہوتے ہیں کہ کونسا دولتمند امیدوار ان کے ووٹ کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہے۔ امیدوار چاہے ناقابل ہو یا بد دیانت، قوم فروش ہو یا غدار ملک اسکے لئے دولتمند اور سرمایہ دار ہونا لازمی ہے، وہ دولت کے بل بوتے پر پہلے کونسل کا ممبر بنتا ہے، پھر وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوتا ہے، اب جس نے اسکی کامیابی کے لئے ووٹ دیا ہے وہ اس کے دفتر یا دروازہ پر حاضر ہو کر کہتا ہے کہ میں نے آپ کو ووٹ دیکر وزیر بنایا ہے۔ میرا بیٹا اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں۔ ان دنوں بیکار پھر رہا ہے، اسے کسی محکمہ میں اعلیٰ ملازمت دلوادو۔ مجھے لکڑی، موٹر لاری یا کسی اور چیز کا درآمدی لائسنس اور پرمٹ دلوادو۔ تاکہ میں جی کھولکر ناجائز روپیہ کما سکوں۔ یا میرے نام ہندوؤں کی متروکہ جائیداد۔ مکانات، دوکانیں اور سرائے وغیرہ آلاٹ

کردو۔ علیٰ ہذا القیاس وزیر صاحب حیران ہو کر کہتا ہے، کہ یہ باتیں میرے اختیار سے باہر ہیں۔ میں تمہاری ان گوناگوں خواہشات کو کسطرح پورا کر سکتا ہوں۔ تو وہ بگڑ کر کہتا ہے۔ صاحب! میں نے ثواب کی غرض سے تو آپ کو ووٹ نہیں دیا تھا، ووٹ دینے میں میرا مقصد یہی تھا کہ آپ انتخاب جیت کر میرے کام آئیں گے، اُسوقت تو آپ نے ہمیں سبز باغ دکھائے تھے، اب آپ نے آنکھیں پھیر لیں خیر آئندہ انتخابات میں دیکھا جائے گا۔

وزیر صاحب مجبور ہو کر اپنے سیکرٹری کے نام ایک خط لکھکر اسے دیدیتے ہیں اور کہتے ہیں تم اس کے پاس جاؤ تمہارا کام ہو جائے گا۔ وہ جب خط لیکر باہر جاتا ہے تو وزیر صاحب اپنے سیکرٹری کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے مجبور کر کے تمہارے نام ایک خط حاصل کیا ہے جب وہ تمہارے پاس آئے تو زبانی طور پر اسے خوش کر کے دفع کرو۔ اور میرا خط اس سے لیکر پھاڑ ڈالو۔

اکثر اوقات بڑے بڑے افسروں اور وزیروں نے مجھے کہا ہے کہ بعض لوگ وفد کی صورت میں ہمارے پاس آ کر کہتے ہیں کہ فلاں تھانیدار بڑا ظالم اور رشوت خور ہے اسے تبدیل کیجیے۔ اس وفد کے رخصت ہونے کے بعد دوسرا وفد آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تھانیدار بہت محنتی شریف اور کارکن ملازم ہے اسکو ترقی ملنی چاہیے۔ اب بتائیے کہ ہم کس کے کہنے پر یقین کریں، اور کس کے کہنے پر یقین نہ کریں۔

ہم نے ایک فہرست مرتب کی ہے جس میں ان لوگوں کے نام درج ہیں، جو سفارش لے کر یا اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے سلسلے میں ہمارے پاس آتے ہیں کہ اگر کسی وقت یہ لوگ ہمارے خلاف کوئی سازش کریں یا جلسے جلوسوں میں شور مچائیں تو ہم اپنی گلوخلاصی کے لیے وہ فہرست پیش کر کے ان کی خود غرضی اور دروغ گوئی کو ثابت کر سکیں،

ان تمام تجربوں کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ موجودہ

جمہوریت کے مقابلے میں شخصی حکومت بہتر ہے اس صورت
میں تمام اختیارات صدر مملکت کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں
تاکہ وہ آزادی کے ساتھ ملک و قوم کی بہتری کی تجویزیں سوچے
اور ان پر بلا روک ٹوک عمل پیرا ہو جائے۔ صلاح و مشورہ کے
لئے قوم سے بھی استصواب رائے درست ہے۔ مگر حکومت کی
کنجی ایک ہی کے قبضہ میں ہونی چاہیئے،

اس سلسلہ میں ایک سادہ دلیل پیش کرتا ہوں۔ کہ اگر ایک
خاندان میں دس افراد زن و مرد ہوں۔ صبح کے وقت گھر کی مالکہ یا
والدہ ان سے پوچھے کہ آج کھانے کے لئے کیا پکایا جائے؛
ایک کہے حلوہ۔ دوسرا کہے پلاؤ۔ تیسرا کہے قورمہ اور سالن۔ وغیرہ
تو اس گھر کا انتظام خورد و نوش کبھی بھی درست نہیں رہیگا۔ لازم
یہی ہے کہ تمام اختیارات مالکہ کے ہاتھ میں ہوں۔ تاکہ جو کچھ وہ
مناسب سمجھے پکائے۔ البتہ اگر کبھی کبھار گھر کا کوئی فرد پلاؤ یا حلوہ
یا فرینی وغیرہ کی فرمائش کرے تو اسے پورا کرنے میں کوئی حرج
نہیں،

تقسیم ملک کے وقت سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے جن جن کو موقع ملا، انہوں نے ہزاروں انسانوں کو قتل کر دیا، لوگوں کے گھر بار لوٹ لئے گئے، عورتوں کو اغوا کر لیا گیا، جائیدادیں نذر آتش ہو گئیں، مگر ریاست سوات، دیر، امب میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی، کہ کسی ہندو یا سکھ کو قتل کیا گیا ہو، یا اس کی جائیداد کو نقصان پہنچایا گیا ہو، کیوں؟ اس لئے کہ حکومت کی باگ دوڑ ایک ہاتھ میں تھی، میں نے اپنے تجربے کی بناء پر جو کچھ سمجھا نیک نیتی سے اس کا اظہار کر لیا،

من آنچہ شرط بلاغ است با تو مے گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

موجودہ طرز حکومت کے آثار و علائم سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ملت کے لئے فلاح و اصلاح کی کوئی امکانی امید باقی نہیں رہی، ہاں۔ اگر خدائے بزرگ و برتر اپنے خاص لطف و کرم سے کوئی غیبی سبب پیدا کرے تو اسکی مہربانیوں سے بعید نہیں ؎

طائرِ دولت اگر باز گذارے بکند ہاں مروے از غیب بروں آید و کارے بکند

بازآمدم بر سرِ داستان؟

ہمارا طیارہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر کوہ ہندوکش کی برف پوش چوٹیوں اور سنگین دروں کو عبور کرتا ہوا ترکستان کے میدانی علاقہ میں پہنچا، ایک بجہ دوپہر کا وقت تھا کہ ہم ترکستان کے ہوائی اڈہ پر اترے، یہ اڈہ خام ہے، حاکم اعلیٰ ترکستان موٹروں کے ساتھ اس وفد کی پیشوائی کے لئے یہاں موجود تھے، موصوف نے ہماری پذیرائی کی، اور ہم موٹروں میں بیٹھکر مزار پر انور حضرت شاہ ولایت پر حاضری دینے کے لئے روانہ ہو گئے، ہوائی اڈے سے مزار شریف تک جو راستہ ہے وہ خراب اور گرد آلود تھا، جس وقت ہم مرقد مبارک حضرت علی ابن ابی طالب پر پہنچے ایک گنبد نظر آیا جس کے سامنے گنبد سپہر ناصیہ فرسائی کرتا تھا، اس مزار کو سلطان حسین شاہ ہرات نے ایک ہزار سال قبل تعمیر کیا تھا یہ گنبد سبز و عالی بغایت خوبصورت اور شاندار ہے، یورپ میں نپولین بوناپارٹ کی قبر فن تعمیر کے لحاظ سے بہت مشہور ہے مگر یہ گنبد بھی اس سے کم نہیں، گنبد کے اندر صرف حضرت شاہ ولایت

کا مرقد مبارک ہے. گنبد کا اندرونی احاطہ بہت کشادہ اور وسیع ہے جو فرش وفروش اور قالینوں سے آراستہ ہے یہاں دس "ملا" صاحبان کھڑے ہوئے تھے۔ جس وقت ہم احاطہ میں داخل ہوئے تو ایک مُلاّ نے تلاوت قرآن مجید شروع کی ہم سب تعظیماً کھڑے رہے، جس وقت تلاوت قرآن پاک ختم ہوگئی تو ہم نے مزار مبارک حضرت شاہ ولایت پہ فاتحہ پڑھکر دعا مانگی، اور احاطہ گنبد سے باہر آئے. مجاورین زیارت نے ہمیں قرآن مجید کے چند بزرگ اور قدیمی نسخے دکھائے، جو خط کوفی میں لکھے ہوئے تھے، ان کے متعلق کہا گیا کہ حضرت شاہ اولیاؑ نے اپنے دست مبارک سے یہ قرآن لکھے تھے، واللہ اعلم بالصواب

ایک طرف پتھر کا ایک ٹوٹا ہوا ٹکرا بھی پڑا تھا، جس پر تحریر تھا.

ھذا مرقد علی ابن ابی طالب

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے سلطان حسین شاہ ہرات نے خواب میں دیکھا کہ اس مقام میں جسد مبارک حضرت علی ابن

ابی طالب مدفون ہے، اس کے بعد حضرت ملا عبدالرحمن جامی نے بھی یہی خواب دیکھا تھا، اور یہ رباعی موزون کی

گویند کہ مرقد علی در نجف است
در بلخ بیا ببین کہ آن ذوالشرف است
نے در عدن است ونہ بہ بیت الشرفین
آفتاب یکیست ونورش ہر طرف است

جب لوگوں نے اس مقام کو کھودا تو وہاں سے یہ پتھر برآمد ہوا یقین کیا گیا کہ جسد مبارک بھی یہیں مدفون ہے، یہاں شاہ حسین نے موجودہ گنبد تعمیر کیا، اس زمانے کے معماروں پر آفرین ہے کہ انہوں نے ایسا خوبصورت خوشنما اور مستحکم گنبد بنایا، اور اس پر ایسے نقش و نگار ثبت کئے جو زمانہ قدیم کی بہترین یادگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے،

گنبد سے باہر نکل کر قریشی صاحب نے جو ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارا گروپ فوٹو بھی لیا۔ سردار عبدالرشید خان وزیر صنعت نے مبلغ بیس ہزار افغانی روپیہ مجاوروں کو بطور نذرانہ

عطا کیا، گنبد کے باہر۔ امیر شیر علیخان۔ سردار محمد اکبر خان غازی
اور جمعہ خان پسر اعتماد الدولہ کے مزارات ہیں۔

حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ امیر شیر علی خان کے مزار پر
ان کی تاریخ وفات نہیں لکھی گئی ہے۔ میں نے اس کا ذکر حاکم
اعلیٰ سے کیا۔

یہاں سے رخصت ہو کر ہم نے جدید بازاروں کی سیر کی۔ پرانا
بازار منہدم ہو چکا ہے۔ اس سیر و تفریح کے بعد ہم حاکم اعلیٰ
کی کوٹھی میں پہنچے، حاکم صاحب کی یہ کوٹھی اور باغ حد
درجہ پر رونق ہے۔ میرے دریافت کرنے پر کہا گیا کہ قبلاً یہ
امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم کی نشستگاہ تھی،

حاکم اعلیٰ کا نام غلام نبی خان ہے جو نورستان افغانستان
کا باشندہ ہے اور ایک خلیق شریف اور ملنسار انسان ہے
اس سے قبل چونکہ حاکم صاحب نے مجھے پشاور میں دیکھا
تھا، اس نے مجھے پہچان لیا، دوپہر کا کھانا حد درجہ
لذیذ اور پر تکلف تھا جس میں ہر قسم کے کھانے

پینے کی چیزیں اور پھل وغیرہ موجود تھے، خصوصاً یہاں کا نورسیدہ خربوزہ جو حد درجہ شیرین اور لذیذ ہوتا ہے یہاں کے لوگ اس کو خشک بھی کرتے ہیں۔ کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد حاکم صاحب نے ہر ایک مہمان کو ایک ایک عدد پوست قرہ قولی اور ایک ایک ٹکڑہ وطنی ساخت کا کپڑا بطور تحفہ عنایت کیا، جس طیارہ پر ہم یہاں آئے تھے وہ ہمیں یہاں چھوڑ کر میمنہ اور بلخ کی طرف گیا تھا، ۳ بجے عصر وہ طیارہ واپس آیا تو ہم اس پر سوار ہو کر کابل واپس چلے آئے، یہ سفر حد درجہ پر لطف تھا، کابل میں وہی حسب معمول سیر و تفریح کا مشغلہ جاری تھا، یہاں تک کہ میرے ہمراہی واپس پاکستان چلے گئے، اور میں اپنی خواہش کے مطابق کابل میں رہ گیا تھا تاکہ اپنے ملک کی خوب سیر کروں۔

قیام کابل

میرے ہمراہیوں کی روانگی کے بعد مہمان دار نے مجھ سے کہا کہ کابل یہاں سے آٹھ میل دور ہے ، اور آپ یہاں اکیلے ہیں ۔ لہٰذا سردار غلام محمد خان وزیر تجارت افغانستان نے آپ کے قیام کے لئے کابل ہوٹل میں ایک علیحدہ کمرہ نمبر ۲۱ مخصوص کیا ہے ۔ جس میں آپ سرکاری مہمان کی حیثیت میں ٹھہر سکتے ہیں ۔ میں نے کہا حکومت کی اس مہربانی کا حد درجہ شکریہ ۔ مگر میں سفیر کبیر پاکستان کا مہمان ہوں میرے یہاں آنے کی غرض یہ ہے کہ میں اپنے ملک قوم اور عزیز و اقارب کو دیکھوں اور جی بھر کر ان سے ملاقات کروں ۔ میں سفیر صاحب سے دریافت کروں گا اور جو کچھ ان کی مرضی ہوگی ۔ اسی پر عمل پیرا ہوں گا ۔ چنانچہ میں موٹر لے کر سفیر صاحب کے گھر پہنچا ؛ اور صورت حال ان سے بیان کی ۔ سفیر صاحب نے کمال مہربانی

سے فرمایا کہ آپ میرے محترم چچا ہیں۔ اپنا گھر چھوڑ
کر آپ کو ہوٹل میں رہنے کی کیا ضرورت ہے، میرے
بنگلہ کے احاطے میں جو مہمان خانہ ہے، اس میں دو کمرے
موجود ہیں۔ جن میں ضروریات کی تمام چیزیں حاضر ہیں
اس مہمان خانہ میں میں نے آپ کے لئے دو کمرے سونے
اور مطالعہ کرنے کے لئے تیار کر لئے ہیں، آپ یہیں قیام
کریں۔ یہ کہکر اس نے میرا سامان دارالامان کے مہمان
خانہ سے منگوالیا، اور حکومت کابل کو شکریہ کے ساتھ
یہ اطلاع روانہ کردی۔ کہ میرا مہمان میرے ہاں مقیم ہے
ہوٹل میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سفیر صاحب نے
مجھ سے کہا کہ آپ آزادی کے ساتھ یہاں رہیں۔ اور اپنے
دوست واحباب سے ملیں۔ باہر جانے کی ضرورت ہو
تو موٹر موجود ہے۔ اگر آپ کھانے کے وقت یہاں تشریف
لائیں تو بہتر ہے۔ اگر کہیں باہر کسی دوست کے ہاں آپ
مدعو ہوں۔ تو مضائقہ نہیں۔ آپ کو پوری آزادی حاصل

ہے، میں نے سفیر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر آقائے محمد عتیق جان اور ان کا بھائی محمد رحیم جان میری ملاقات کے لئے تشریف لائے، یہ دونوں بھائی میرے زمانہ قیام کشمیر و ہندوستان اور پاکستان کے قدیمی دوست ہیں۔ ان کی والدہ صاحبہ مرحومہ نہائیت بزرگ و محترم خاتون تھیں، ان کی دو بہنیں۔ شاہ بوبو صاحبہ اور بی بی گل صاحبہ مجھے اپنا بھائی تصور کرتی تھیں۔ اور میں بھی ان کو اپنی بہنوں سے کم نہیں جانتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے سفیر صاحب سے ملاقات کرنے کے بعد اجازت طلب کی۔ کہ میں دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ سفیر صاحب نے کہا یہ جہاں جانا چاہیں۔ جا سکتے ہیں۔ ان پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ میں ان دو بھائیوں کے ساتھ محترم عتیق جان کی قیام گاہ میں پہنچا، یہ کتنا خوبصورت اور خوش منظر بنگلہ ہے۔ جس میں باغ تالاب، اور ہر قسم کے میوہ دار درخت موجود ہیں، عتیق جان کی خانم محترم اور ان کی پیاری بچی

مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں ہیں بھی ان سے
مل کر بہت محظوظ ہوا۔ تھوڑی دیر تک بات چیت کی
کھانا آیا۔ تو وہ بھی بے حد خوش ذائقہ اور لذیذ تھا۔
پھر میوؤں کا کیا کہنا سبحان اللہ چند گھنٹوں کے بعد میں
ان سے رخصت ہو کر اپنے گھر پہنچا۔ اور آرام کیا۔

کوہستان کی سیر

اسی طرح دن گذرتے رہے یہاں تک کہ میں
نے ایک دن ارادہ کیا کہ کوہستان جاؤں۔ اور اپنے
خویش واقارب اور قوم والوں کی ملاقات سے
بہرہ مند ہو جاؤں

سفیر صاحب نے میرے لئے ایک جیپ کا انتظام
کیا تھا، مگر میرے ایک دوست عبد العزیز خان نے
مجھ سے کہا کہ کوہستان کا راستہ خراب ہے۔ جیپ
کے جھٹکے آپ کی کمر کے درد کے لئے مضر ہیں۔ میرے پاس

ایک روسی موٹر ہے جس کی کمانیاں آرام دہ مضبوط اور لچکدار ہیں۔ اس میں بیٹھ کر آپ آرام سے سفر کر سکتے ہیں۔ میں خود آپ کو کوہستان پہنچاؤں گا۔ اور پھر جب واپس لوٹنے کا ارادہ ہو تو مقررہ دن کو میں آپ کو واپس لاؤں گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی موٹر میں جانا منظور کر لیا۔ صبح کے وقت میں اپنے آنے کی اطلاع دیئے بغیر ناصر جان اور ایوب خسروی اپنے دو بھتیجوں کے ساتھ عازم کوہستان ہوا دس میل تک سڑک کافی کشادہ تھی، گویا اس پر تارکول بچھایا گیا تھا، اس کے آگے سڑک کی مرمت کا کام جاری تھا، اس لئے سڑک خراب تھی۔

ہم جس وقت کوتل خیر خانہ سے آگے بڑھے تو دونوں طرف میوہ دار باغات، خصوصاً انگور کے بے شمار باغات نظر آئے، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی سرسبز و شاداب وادی پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں نے

ساٹھ سال قبل۔ گھوڑے پر بیٹھکر اسی راستے سفر کیا تھا، اس سفر میں میرے والد صاحب مرحوم کے اردل سوار اور دو قومی سوار بھی ہمارے ساتھ تھے

آپ اندازہ لگائیں میرے دل پر جو تاثر قائم ہوا وہ کہنے میں نہیں آسکتا، میں ماضی کے خیالات میں مستغرق تھا، زمانہ گذشتہ کے واقعات پردہ تصویر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے،، میری والدہ محترمہ اپنی کنیزوں کے ساتھ کجاووں میں بیٹھی ہوئی تھیں ہم گھوڑوں پر سوار کابل سے کوہستان کی طرف جارہے تھے، رات کو موضع چگک میں قلعہ سیف الدین خان میں جو میرا پھوپھا تھا، قیام کیا۔ اور اسی راستے کوہستان کیطرف روانہ ہوئے۔ وہ زمانہ اور وہ قافلہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ میں نے پوچھا اس خاندان سے کوئی باقی رہ گیا ہے؟ معلوم ہوا کہ ان کا نام ونشان تک باقی

نہیں رہا۔ وہ لوگ بھی ہمارے جرم بے گناہی کی پاداش
میں بالامر غاب ترکستان کی طرف فرار ہو کر تباہ و برباد
ہو گئے۔

مختصر یہ کہ ہم چاریکار پہنچے، یہاں کیا دیکھا تھا، اور
اب کیا دیکھنے میں نظر آیا، پرانی عمارتیں اور بازار مسمار
ہو چکے ہیں۔ ان کی جگہ پر جدید بازار اسکول کے لئے
ایک عمارت اور ایک ایسا مختصر سا شہر آباد ہوا ہے جس
کی کسی جگہ کو میں شناخت نہ کر سکا۔ وہاں میرا چچا زاد
بھائی محمد کریم جان جو کسی سرکاری عہدہ پر مامور ہے،
موجود تھا، مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا، اور پوچھا کہ آپ
اطلاع دیئے بغیر ہی چلے آئے؟ اگر آپ یہاں پیشتر خبر
دیدیتے تو ہم آپ کی پیشوائی کے لئے آتے، میں نے
کہا یہی مناسب تھا جو میں نے کیا اسنے کہا قوم کے لوگوں کے علاوہ حاکم اعلیٰ
بھی آپ کے آنے کا منتظر تھا، وہ بھی آپ کی پذیرائی کرنا
چاہتا تھا، میں نے اپنے ہمراہیوں سے کہا چلئے پہلے حاکم صاحب سے ملاقات

کریں۔ اس کے بعد اپنے قلعہ جات کی طرف جائیں گے حاکم صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آپ دورہ پر تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے قائمقام سے ملکر میں نے حاکم صاحب کے لئے پیغام و سلام عرض کیا۔ کہ انہیں پہنچا دیں۔ اس نے بھی کہا کہ حاکم صاحب آپ کے آنے کے انتظار میں تھے، میں نے کہا میرا شکریہ ان کی خدمت میں عرض کر دینا۔ میں انشاءاللہ واپسی پر ان کا نیاز حاصل کروں گا، یہاں سے ہمارا قلعہ دوالا تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ میرے ہمراہیوں نے کہا کہ موٹر کا راستہ صاف ہے ہم نے سڑک کی مرمت کر لی ہے۔ میں نے ان کے کہنے پر اعتبار کیا، اور آگے روانہ ہو گیا،

تھوڑا سا راستہ طے کیا تھا کہ دیکھا کہ آگے راستہ باغات میں سے ہو کر گذرتا ہے، یہ اس قدر تنگ ہے کہ اس پر موٹر چلانا ناممکن ہے۔ چونکہ واپس جانے

کا راستہ بھی نہیں تھا۔ ہم لوگ چار و ناچار اسی راستے پہ آگے بڑھ گئے، صد آفرین ہے ڈرائیور پہ اور ہزار آفرین ہے اس موٹر پر جس نے اس خراب تنگ اور پُر نشیب و فراز راستے کو طے کیا۔ یہ دُنیا کی سب سے پہلی موٹر ہے جو یہاں تک پہنچی۔ اکثر مقامات پر ٹوٹے ہوئے پلوں اور ناہموار راستوں اور گڑھوں کے قریب ہم موٹر سے اُترتے، اور اسے دونوں طرف سے دھکیل کر کشاں کشاں باہر نکالتے تھے موٹر کی آواز سن کر زمیندار اور باغبان ادھر اُدھر سے جمع ہو کر ہماری امداد کے لئے آتے، اور موٹر کو آگے بڑھاتے تھے۔
مختصر یہ کہ بعد از ہزار خرابیٔ بسیار، ہم قلعہ دولانہ پہنچے میرے بھتیجے اور دیگر خویش و اقارب کو خبر ملی تو وہ حیران رہ گئے، کہ میں انہیں اطلاع دیئے بغیر کیسے آ گیا،
خیر یہاں سب نے مجھے خوش آمدید کہا، میں نے باری باری سب سے مصافحہ اور معانقہ کیا، اس کے بعد میں نے پوچھا کہ اب موٹر کا رُخ چار لیگار کی

طرف کس طرح پھیرا جائے ۔ انھوں نے کہا ابھی اس
کا انتظام ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ گاؤں کے لوگ بیلچے اور تبر
لے کر آ گئے اور موٹر کے سامنے جو ایک ناہموار میدان
تھا اسے صاف کیا ، جس سے موٹر کا رخ آسانی سے موڑ دیا گیا ،

اب ہم قلعہ میں داخل ہوئے ، ۱۸۹۲ء میں وطن سے
فرار ہونے سے قبل میرے والد صاحب مرحوم نے اس قلعہ
کی تعمیر کا کام شروع کیا تھا ، قلعے کی دیواریں چار چار
فٹ بلند ہو چکی تھیں کہ اس تعمیر کو ادھورا چھوڑ کر مرحوم
کو ترک وطن کرنا پڑا ۔ جس کا ذکر نور کہستان میں
موجود ہے ، اس وقت اس قلعہ کا احاطہ بہت وسیع
تھا ۔ اب میرے چار بھتیجوں نے اسے چار حصوں میں تقسیم
کر کے اپنے لئے جدید طرز کی عمارتیں ، باغات ، چمن
اور بنگلے تعمیر کئے ہیں ۔ ان بنگلوں میں ہر قسم کا فرنیچر
میز ، کرسی ، صوفے اور کوچ وغیرہ ۔ نیز فرش و فروش قالین
اور آرائش و زیبائش کے تمام سامان ،

موجود ہیں،

اعزہ واقارب سے ملاقاتیں

میرے دوست عزیز نے جس نے مجھے کابل سے یہاں تک پہنچایا تھا، شربت وغیرہ پینے کے بعد کہا کہ مجھے کابل میں ایک ضروری کام درپیش ہے، اس لئے واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں، میرے میزبانوں کا یہ اصرار تھا کہ آپ کھانا کھا کر چلے جائیں، مگر میں نے کہا کہ ابھی ۱۱ بجے کا وقت ہے کھانا تیار کرنے میں کم از کم دو گھنٹے صرف ہونگے۔ یہ اتنی دیر تک یہاں انتظار نہیں کر سکتے انہیں رخصت کریں، البتہ چند بیلدار ان کے ساتھ کر دیں کہ وہ چاریکار تک راستہ صاف کر دیں، یہ لوگ چلے گئے اور ہم یہیں رہ گئے، تھوڑی دیر میں گاؤں کے لوگوں کو میرے آنے کی خبر ہوئی تو لوگ جوق درجوق میری ملاقات

کے لئے آنے لگے، ان میں بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سب ہی شامل تھے، جو بھی آتا میرے ہاتھ چومتا، میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچانتا تھا، نہ اپنے سفید ریش بھانجوں کو اور نہ ان کے بیوی بچوں کو، میرا بھتیجا ناصر جان مجھ سے ایک ایک کا تعارف کراتا تھا، یہ آپ کا فلاں بھتیجا ہے۔ یہ اس کی خانم اور یہ اس کی والدہ ہے، یہ اس کے بچے اور یہ اس کے پوتے اور پوتیاں ہیں، علیٰ ہذالقیاس میں پوچھتا تھا کہ اس خانم کا کیا نام ہے، اس کے والد کا کیا نام تھا، اس خانم کی والدہ کس کی بیٹی یا پوتی تھی، جب وہ ان کے بزرگوں کا نام بتاتے تھے تو میں انہیں پہچان لیتا تھا، یہ بھی ایک عجیب تماشا تھا، کہ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھتے تھے، ان کے خیال میں میں ایک سفید ریش، عمامہ سر پہ، چوغہ پوش اور سبحۂ صد دانہ در دست بوڑھا تھا، مگر مجھے انگریزی لباس میں ملبوس، داڑھی مونچھ صفا چٹ اور ٹوپ اوڑھے

ہوئے دیکھکر انہیں حیرت ہوتی تھی کہ ہم نے کیا تصوّر
کیا تھا، اور یہ کیا دیکھنے میں آیا، بہرحال خون کی کشش
اور جانبین کی محبت نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب
تر کر دیا۔ اور ہم میں صادقانہ خلوص اور یک رنگی کی کیفیت
پیدا ہوگئی، یہ لوگ مجھے احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے
تھے، اور میں انہیں آرام اور فارغ البالی کی حالت میں
دیکھکر مسرور ہوتا تھا، کہ الحمد للہ میرے وطن کے عزیز و
اقارب باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں، میں اگر ہلتا
بھی تھا تو ان میں سے کوئی میرا بازو پکڑ کر مجھے سہارا
دیتا، کوئی میرے پاؤں کے سامنے جوتے رکھتا، کوئی
میرے پاؤں دباتا، اور کوئی پنکھا لے کر جھلنے لگتا تھا، میں
محسوس کرتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی
کہ کسی نہ کسی طرح میری کوئی خدمت بجالائے، میں یہ
دیکھکر خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

ہماری قوم میں عزیزوں اور رشتہ داروں سے پردہ

کرنے کی رسم نہیں، یہ لوگ خواتین کو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، خواتین بھی انہیں باپ، بھائی اور بیٹوں سے کم تصور نہیں کرتیں، بدنگاہی کا یہاں وجود تک نہیں، زمانہ قدیم سے اب تک یہی رویہ ہمارے خاندان میں جاری ہے

اب کھانا تیار ہوگیا، اس قلیل وقفے میں اُنہوں نے مرغ پلاؤ، کباب، سالن، شیرینی اور میووں کا اتنا شاندار انتظام کیا تھا جسے دیکھکر طبیعت بشاش ہو گئی، کھانا کھانے اور چائے نوشی کے بعد میں نے کہا، اب میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں، انہوں نے مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچایا۔ جو فرش وفروش سے آراستہ تھا، پلنگ پر صاف سُتھرا بستر تیار تھا یہاں کوئی میرے جوتے اتارنے، کوئی میرے کوٹ اتارنے اور کوئی میرے پاؤں دبانے میں لگ گیا میں نے مسکرا کر کہا۔ آپ لوگوں کا شکریہ مجھے اس

کی عادت نہیں، مجھے ایک دو گھنٹہ کے لئے سونے
کی اجازت دیدیں، یہ کہکر میں پلنگ پر لیٹ گیا، پھر
بھی دو نوجوان میرے کمرے کے دروازہ سے باہر بیٹھے
رہے کہ کہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے، میں
نے خوب آرام کیا، تین بجے عصر جاگ اُٹھا، آواز دی
یہ دونوں نوجوان آئے اور کہا کہ چمن میں چائے پینے
کا انتظام کیا گیا ہے، زمین پر فرش کیا ہے۔ آپ کے
لئے کرسی رکھی ہے آپ وہیں چائے نوش کریں،
دونوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھے سہارا دیا۔ اور وہاں
پہنچا دیا، چائے اور ہر قسم کے کلچے وغیرہ موجود تھے،
چائے نوشی کے بعد ہماری محفل گرم ہوگئی، اسی دوران میں
میرے ایک بھتیجے محمد شعیب خان نے کہا کہ ہم نے ۳۵
سال سے اپنے باغ میں کلنگوں کا ایک جوڑا پال رکھا
ہے۔ چار سال ہوئے کہ مادہ کلنگ نے انڈے دینے
اور بچے نکالنے شروع کئے ہیں، ہر سال وہ دو بچے دیتی

ہے، آج تک کبھی یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ جنگلی
کلنگ کسی گھر میں بچہ کشی کریں۔ بیس دن ہوئے
کہ ان کے بچے پیدا ہوئے ہیں، پھر اپنے بیٹے سے
کہا کہ جاؤ وہ بچے باغ سے لے آؤ۔ بچے آئے تو دیکھا
کہ ان کی صورت مور کے سارس کے بچوں کی سی تھی
دانہ ڈالا تو وہ چگنے لگے، اور ادھر اُدھر پھرنے لگے،
میرے بھتیجے نے کہا کہ کوہستان کے ایک موضع میں
دو جوڑے جنگلی کلنگ ۱۵ سال سے مقیم ہیں اس سے
پہلے جو عمر ان کی تھی اس کے علاوہ ہے

اسی دوران میں میری قوم کے وہ لوگ بھی میری
ملاقات کے لئے آئے جو خواجہ خضری یا دیہہ قاضی
میں رہتے تھے، ان لوگوں میں میرا ایک بھتیجا برگیڈیر
عطاءالحق بھی تھا جس کو میں نے چھ سال کی عمر میں
دیکھا تھا، اب اس کی داڑھی سفید ہو چکی تھی
میں نے اسے پہچان کر بے حد خوشی کا اظہار کیا،

کہ خدا نے ایک قدیمی صورت کے دیکھنے کا موقع عطا کیا۔ یہ لوگ سب کے سب قالین پر بیٹھے ہوئے۔ اور میں کرسی پر بیٹھا ہوا ایک دوسرے کی صحبت اور ملاقات سے محظوظ ہو رہے تھے، اس ضمن میں گذرے ہوئے زمانے کی باتیں۔ اور ان زحمتوں کا ذکر درمیان میں آیا جو ہمیں قیام ہندوستان میں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہم خدا کا شکریہ بھی ادا کرتے جاتے تھے کہ ہمارے خاندان کا نام و نشان باقی ہے، اور خاندان کے سب لوگ عزت آرام اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رات کا کھانا جو حد درجہ پر لطف تھا۔ کھا لیا گیا۔ تو تقریباً گیارہ بجے شب یہ لوگ قالینوں کے فرش پر۔ اور میں پلنگ پر سو گیا۔ موسم

خوشگوار تھا۔ خوب نیند آئی۔ صبح تڑکے ہی اُٹھا۔ یہ لوگ بھی جاگ اٹھے تھے، برخوردار عطاء الحق برگیڈیر دیہہ قاضی چلا گیا تھا۔ اور ہم سب کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دے گیا تھا میں نے رات کو اپنے میزبانوں سے کہا تھا کہ پرانے زمانے کی ایک قسم کی روٹی تیار کی جاتی تھی، جس میں قروت رکھکر اسے گھی میں تل لیتے تھے، اس روٹی کو قلنغی کہتے تھے۔

صبح چائے کے ساتھ دیکھا تو وہ روٹی بھی حاضر تھی، بڑی مدت کے بعد میں نے یہ روٹی کھائی تو زمانہ قدیم کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہی خوشبو، وہی مزہ، اور وہی ذائقہ تھا...

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ دیہہ قاضی تک جو خواجہ خضر ہی میں یہاں سے تین میل کے فاصلہ پر واقع تھا کس طرح جایا جائے کسی نے کہا کہ آرام کرسی کے

کنارے پر مضبوط لکڑیاں باندھ کر اور اسے ڈانڈی
کی صورت میں آدمیوں کے شانوں پر رکھکر مجھے اس
میں بیٹھایا جائے، اور دیہہ قاضی تک پہنچایا جائے
باالاخر برخوردار محمد کریم جان نے یہ تجویز پیش کی کہ
میرے پاس ایک گھوڑا ہے بہت شریف اگر آپ اس
پر سوار ہو جائیں تو وہ آپ کو آرام کے ساتھ دیہہ قاضی
پہنچا دیگا۔ میں نے کہا میرے لئے گھوڑے کی سواری
مشکل نہیں میں تو پولو کا کھلاڑی ہوں۔ اور مشکل یہ ہے
کہ جب سے میری کمر میں چوٹ آئی ہے میں گھوڑے
پر بیٹھ نہیں سکتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں درد میں اضافہ
نہ ہو جائے، انہوں نے کہا کہ آپ آزمائیں تو سہی
اس کے بعد انہوں نے گھوڑے کو ایک چوکی کے
قریب کھڑا کر کے اور مجھے سہارا دیکر زین پر بٹھا دیا۔
میں نے بدن کو حرکت دی تو کمر میں درد محسوس نہیں ہوا۔ بہت
خوب کہکر ہم دیہہ قاضی کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرے ہم قوم

اور عزیز و اقارب گھوڑے کے ساتھ ساتھ پیادہ رواں۔ میں مغربی لباس پہنے ہوئے گھوڑے پر سوار۔ یہ قافلہ باغات کے درمیان۔ تنگ راستوں، بہتے ہوئے نالوں اور جدید مرمت شدہ پلوں پر سے گذرتا ہوا۔ بالآخر خدا خدا کر کے قلعہ خواجہ خضری کی حدود میں داخل ہوا۔ یہاں نہ قلعہ کا نام و نشان تھا۔ نہ باغات و عمارات کا اور نہ حوض وغیرہ کا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا، یہ کیا ہوا؟ جواب ملا۔ انقلاب' تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

جہاں ہماری کوہ و دامن بستی۔ جہاں بچپن میں میں اپنے ہمعصر بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جس باغ میں درختوں پر چڑھ کر میوے کھاتا تھا۔ جس مدرسہ میں سبق پڑھتا تھا جس حوض میں نہاتا تھا۔ ان میں سے ایک چیز بھی باقی نہیں تھی فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِى الْاَبْصَارِ۔ کہہ کر ہم آگے بڑھ گئے ہمارے آباؤ اجداد کے مقبرے۔ ان سے بھی زیادہ ویران نہ وہ پھولوں کی کیاریاں موجود۔ نہ وہ سبزہ زار۔ چند

ٹوٹی ہوئی قبریں موجود تھیں۔ وہ بھی بے نام و نشان۔ ان قبروں کے گرد ایک کچی دیوار کھچی ہوئی تھی جس کی بلندی تخمیناً تین فٹ تھی، میرا بھتیجا یوں ہی اندازتاً بتا رہا تھا کہ یہ میر مسجدی خان غازی وشہید کا مرقد منور ہے۔ یہ میر غلام محی الدین خان غازی وشہید کا مدفن ہے۔ یہ میر درویش خان اور میر احمد خان غازی کی قبریں ہیں وغیرہ۔ میں نے ان مزارات پر کھڑے ہو کر دعائے مغفرت پڑھی۔ اور پوچھا کہ امیر حبیب اللہ خان شہید نے ان مزارات اور گنبد کی درستی اور صاحبزادہ غلام حیدر خان مرحوم کے مرقد کی تعمیر کے لئے جو بارہ ہزار روپیہ کی رقم دی تھی وہ کیا ہوئی! کہا۔ وہ رقم ضائع ہو گئی ہیں نے تعجب کر کے اپنے ہم قوموں سے کہا کہ اب ان مزارات کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔ ہر ایک قبر پر لوح نصب کر کے اس پر متوفی کا نام لکھا جائے۔ نیز مسجد حوض اور درختوں کا بھی انتظام کیا جائے، تاکہ ہمارے آباؤ اجداد کا نشان باقی رہے۔ سب نے میری اس تجویز کو قبول کر لیا۔

میں نے کہا اس کا نقشہ اور خرچ کا تخمینہ تیار کر کے مجھے اطلاع دیدو تاکہ یہ کام درست ہو سکے، پھر میں نے اپنے بھائی کے پوتے برخوردار ایوب خسروی سے جو ایک خوشنویس نوجوان اور شاعر ہے میر مسجدی خان غازی کے لوح مزار پر کندہ کرنے کے لئے ایک موزوں عبارت لکھوائی، اور کہا کہ جس وقت یہ مزار تیار ہو جائے تو اس کی لوح پر یہ عبارت کندہ کرانا - ان مزارات پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں اپنے مرحوم چچا کے دیگر قلعہ جات کی طرف روانہ ہوا - ہمارے سامنے میرے مرحوم چچا میر درویش خان اور غلام صدیق خان مرحوم کے قلعے تھے ان کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مٹی کے ڈھیر کے سوا ان کا نشان تک باقی نہیں رہا - میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتا تھا کہ نگاہ تاسف سے ان کھنڈرات کو دیکھوں - اور خاموش رہوں، جو دردناک تاثر میرے دل و دماغ پر وارد ہوا نہ میں اسے بیان کر سکتا ہوں . نہ آپ اسے سمجھ سکتے ہیں، ہاں اس کا اندازہ وہی دل لگا سکتا ہے جس نے یہاں وہ سابقہ

چہل پہل دیکھی تھی، اور اب یہ تباہی اور بربادی دیکھ رہا ہے
بقول حضرت سعدی شیرازی،

گفتن ز بور لا حاصل بود ؟؟
با یکے در عمر خود نا خوردہ نیش
تا ترا حالے نباشد ہمچو ما !!
حال ما افسانہ مے آید بہ پیش

میں نے پوچھا یہ حالت کیوں پیش آئی۔ کہا کہ آپ اور آپ کے تمام ہم قوم یہاں سے فرار ہو گئے، یہ عمارتیں اور یہ قلعے خالی رہ گئے، جس مقام کا مالک نہ ہو اس کی حالت نا معلوم۔ گھروں کی چھتوں کی لکڑیاں۔ دروازے اور چوکھٹیں۔ غرضیکہ جس کے ہاتھ جو لگا وہ اٹھا کر لے گیا، مثل مشہور ہے کہ "خالی گھر میں دیو بستے ہیں۔" بس یہی صورت یہاں بھی پیش آئی

اب ہم سر پشتہ اور دیہہ قاضی کی طرف روانہ ہوئے۔
آفرین ہے اس گھوڑے پر اسے فرس اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب فراست جانور ہے، پتھر اور لکڑی کے بنے

ہوئے نوساختہ پلوں۔ باریک راستوں اور تندی نالوں کو عبور کرتا ہوا کس خوبی اور دانائی سے یہ جانور میرے پر گناہ جسم کا بوجھ اُٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔

دیہہ قاضی پہنچکر میں نے اپنے مرحوم چچا غلام احمد صاحب کا قلعہ دیکھا، گذشتہ زمانے میں یہ ایک نہایت خوبصورت اور خوش منظر مقام تھا، جس میں عمارتیں۔ سرائے۔ باغ، پھولوں کی روشیں، میوہ دار پیڑ۔ انگور کے سینکڑوں درخت، اور تالاب وغیرہ تھے، اب جو دیکھا تو قلعہ خواجہ خضری سے بھی ویران تر۔

میرے چچا کا ایک نواسہ تھا، عبدالباقی نام جو عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا، یہ ہمارے ساتھ پشاور میں بھی رہ چکا تھا، اس کا حال پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ زندہ ہے۔ اور اس قلعہ کے ایک کونے میں اپنے آبائی گھر میں مقیم ہے، اور بینائی سے محروم۔ اسے اطلاع ملی۔ اپنے ایک بیٹے کے شانے پہ ہاتھ دھرے باہر نکل آیا، عصا ہاتھ میں۔ داڑھی کے بال سفید

کمر خمیدہ۔ میں نے اسے مطلق نہیں پہچانا۔
آہ۔ کہاں وہ جوانی۔ اور کہاں یہ پیری وفرسودگی بقول شاعر ؎

یکے پرسید از پیر دل آگاہ:
چہ گم کردی کہ خم گشتی دریں راہ
جوابش داد پیر خوش تکلم
کہ ایام جوانی کردہ ام گم

اس کا حال احوال پوچھا۔ کہا شکر ہے پروردگار کا، تھوڑی دیر تک اس سے ملاقات رہی۔ پھر خدا حافظ کہکر رخصت ہوا۔
اب ہم بریگیڈیر عطاء الحق جان کے قلعہ میں پہنچے۔ یہ ایک جدید قلعہ ہے جس میں نہایت عالیشان عمارتیں۔ تالاب میوہ دار درخت، اور چمن ہیں۔ یہ قلعہ ایک ٹیلہ پر نہر کے کنارے واقع ہے، جہاں سے تاحد نگاہ نشیب میں کوہستان کی وادی میلوں تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے جس میں دریا، باغات ریگ رواں اور سبزہ زار وغیرہ ہر دیدہ بینا کو دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ سایہ دار درختوں کے نیچے فرش بچھا کر اس پر کرسی

رکھی گئی ۔ جس پر میں بیٹھ گیا ۔ اللہ خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنے
ایک عزیز کو فارغ البال اور آسودہ حال دیکھا ، برگیڈیر صاحب
کے قلعہ کے نزدیک اس کے چھوٹے بھائی محمد کریم جان
نے بھی ایک جدید قلعہ تعمیر کیا ہے جس میں خوبصورت
عمارت اور دلکش باغ موجود ہے ۔ الحمد للہ علیٰ ذالک
کہ ہماری موجودہ نسل کے افراد آرام و استراحت کے ساتھ زمینداری
یا سرکاری ملازمت میں زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں ،
برگیڈیر مذکور نے حکومت کو ایک عمارت کرایہ پر دی
ہے جس میں قوم کے نوجوان بچے ، فوجی تعلیم حاصل کرنے کے
لئے مقیم ہیں ، برگیڈیر مذکور جو ایک عقلمند انسان اور فوجی نظم و
نسق میں پوری مہارت رکھتے ہیں ، ان نوجوانوں کو تعلیم دیتے
ہیں جس کے صلہ میں حکومت کی طرف سے ان کو کافی تنخواہ ملتی
ہے ۔ ان کے ماتحت چند اور فوجی معلم بھی کام کرتے ہیں ، ہم نے
چائے پی کر ۔ اختلاط اور بات چیت شروع کی ۔ یہاں ہماری
قوم کے ، مرد ۔ عورتیں اور بچے کثیر تعداد میں جمع تھے ، جو مجھ

گنہگار کو عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے، میں بھی ان کی طرف دیکھکر حد درجہ محظوظ ہوتا تھا، اور ان کی ملاقات سے لطف اُٹھاتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ خدا کا شکر بھی بجا لاتا تھا کہ اس نے اتنی مدت کے بعد مجھے یہ موقع دیا کہ میں اپنے عزیزو اقارب سے مل سکوں۔

شُکر خدا کہ از مدد بخت کارساز
چیزے کہ خواستم ز خدا شُد میسّرم

کھانے کا وقت آیا۔ پلاؤ کی غوریاں۔ مرغ کباب، بھنا ہوا گوشت، اور دیگر لذیذ کھانے دسترخوان پر چُنے گئے، ہم نے دعا پڑھ کر کھانا شروع کیا، ہماری قوم میں یہ ایک پرانی رسم ہے کہ کھانا شروع کرنے سے قبل اور کھانا ختم کرنے کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں

اَلحمدُ للّٰہِ الذی اَطعَمَنَا وَسَقَنَا۔ تعریف ہے اللہ کے لئے جس نے ہمیں طعام اور پانی سے نوازا۔

چائے نوشی کے بعد میں حسب معمول سو گیا، اور وہ بھی

اپنے کام کاج اور آرام کرنے میں مصروف ہو گئے، عصر کے
وقت ہم سو کر اُٹھے تو چائے تیار تھی، جس کے ساتھ پھل اور
کلچہ وغیرہ کا دور بھی شروع ہوا۔ اسی دوران میں ایوب
خسروی نے کہا کہ میرا چھوٹا بھتیجا جس کا نام محمد اسمٰعیل ہے،
نو برس کی عمر میں حد درجہ خوشنویس ہے، میں نے
اسے اپنے پاس بلایا، کہا۔ کچھ لکھو۔ لکھکر پیش کیا، واقعی
اس عمر میں اتنا خوش خط لکھنا قابل تعریف ہے، میں نے
کہا تیرا بڑا بھائی شاعر ہے، تو بھی شعر کہتا ہے۔ کہا۔ جی
جناب کہتا ہوں۔ میں نے کہا خوشخطی کے لئے میں تم کو
پچاس روپیہ انعام دیتا ہوں۔ شاعری کے لئے بھی پچاس
روپیہ دوں گا۔ کچھ لکھو، چند اشعار لکھے۔ اگرچہ وہ حضرت
بیدل کے اشعار تھے۔ مگر میں نے اس کی دل جوئی
کی۔ شاباشں دے کر انعام دیا۔
جس سے وہ بہت خوش ہوا۔

کوہستان سے کابل کی طرف واپسی

میں نے اپنے دوست عبدالعزیز خان سے کہا تھا کہ وہ دوسرے دن شام کے چھ بجے کابل سے موٹر لیکر چاریکار آجائے تاکہ ہم واپس جاسکیں، دوسرے دن دو بجے کے قریب میں نے اپنے بھتیجے محمد حسن سے کہا کہ تم سائیکل پر بیٹھکر چاریکار جاؤ۔ اور عبدالعزیز خان سے کہو کہ وہ میرا انتظار کرے، میں آتا ہوں۔ اب مشکل یہ درپیش تھی۔ کہ یہاں سے چاریکار تک جو آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے کیسے پہنچا جائے؟ میرے میزبانوں نے کہا کہ راستہ بہت اچھا ہے ہم نے پلوں اور نالوں کو درست کر لیا ہے آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے گی، میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے ایک دوست کی نئی موٹر کو خراب کروں، کہا کہ چاریکار سے میرے لئے ایک کرایہ کی موٹر لائیں۔ میرے

بھتیجے نے کہا۔ کہ میں جیپ کمپنی کا افسر ہوں ستون درہ میں جیپ گاڑیاں موجود ہیں۔ میں ایک جیپ ساتھ لے آؤں گا۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہر ایک کی یہ خواہش تھی۔ کہ میں چند دن اور یہاں قیام کروں۔ مگر میں یہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے فراغت حاصل کر کے کابل پہنچوں۔ اور وہاں سے پشاور چلا جاؤں کیونکہ مہمان داری اور مفت خوری حد سے بڑھ گئی تھی۔

بقول شاعر ؎ ازاں پیش بس کن کہ گویند بس

اگرچہ خدا کے فضل سے بس کوئی نہیں کہتا تھا۔ بلکہ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ میں وہاں زیادہ سے زیادہ قیام کروں۔ بالخصوص ہمارے سفیر کبیر کا خاندان تو دل سے یہی چاہتا تھا کہ میں کچھ دن اور وہاں ٹھہروں۔

میرا بھتیجا محمد حسن چاریکار کی طرف روانہ ہوا۔ اور ہم پھر بات چیت اور اختلاط میں مشغول ہو گئے۔ شام کے ساڑھے چھ بج گئے۔ مگر ابھی تک جیپ کا کوئی پتہ

نہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آج رات میرا جانا نہ ہو سکا۔ اور مجھے یہیں مقیم رہنا پڑا۔ اتنے میں جیپ کی آواز کانوں میں آئی۔ میرے بھتیجے نے آکر کہا کہ "تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ ستون درّہ میں جیپیں موجود نہیں تھیں۔ میں نے حاکم اعلیٰ کو اطلاع دی۔ موصوف نے اپنی جیپ آپ کے لئے بھیجی ہے" میں جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ میرے رشتہ داروں میں سے پانچ آدمی بھی جیپ میں گھس گئے۔ اگرچہ پلوں اور راستوں کی مرمت کر دیگئی تھی پھر بھی جیپ کا خانہ آباد کہ اس نے ہمیں ایک گھنٹے میں چاریکار پہنچا دیا۔ عبدالعزیز خان اپنی موٹر کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ حاکم صاحب کے بنگلہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ آپ موجود نہیں۔ ان کے لئے سلام اور شکریہ کا پیغام چھوڑا اور کابل کی طرف روانہ ہوا۔ رات کو ساڑھے نو بجے ہم کابل پہنچے۔ میرے دوست عبدالعزیز خان نے مجھ سے کہا کہ آپ آج رات یہیں قیام کریں۔ اور کل سفیر صاحب

کے ہاں جائیں ۔ میں نے یہ بات قبول کر کے سفیر صاحب
کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی کہ میں کل پہنچوں گا ۔ چونکہ
موسم گرم تھا ، اور میں تھکا ہوا ۔ راستے کی تکان کو رفع
کرنے کے لئے شربت پیا ۔ اسی اثنا میں دستر خوان بچھ گیا ،
کھانا بے حد لذیذ خوش ذائقہ اور پر تکلف تھا ، میزبان
کی والدہ محترمہ اس کا چھوٹا بھائی جو ایک خوبصورت
نوجوان ہے ، نیز اس کا دوست محمد حسن جان جو کوہستان
کے سفر میں ہمارے ساتھ تھا ، دستر خوان پر موجود تھے ، ہم
سب نے ملکر کھانا کھایا ۔ اس کے بعد میں خواب کے
کمرے میں پہنچا ، جو نہایت سجا ہوا تھا ، بستر نرم اور آرام
دہ ، فلیش سسٹم تشناب اور گرم حمام سب کچھ موجود ۔
رات بھر گہری نیند سویا ، صبح اُٹھ کر مکلف چائے پی ۔
جس میں نیم برشت انڈے ، قسم قسم کے پھل اور کلچے وغیرہ
شامل تھے ، چائے پی کر غسل کیا ، اور کپڑے بدل کر سفیر صاحب
کے بنگلے کی طرف روانہ ہوا ۔

اعلیٰحضرت ہمایونی کے حضور میں شرف باریابی

وہاں سردار محمد علی خان رئیس تشریفات شاہی نے ٹیلیفون کیا کہ اعلیٰحضرت ہمایونی آپ کو شرف باریابی عطا کرنا چاہتے ہیں کل ساڑھے سات بجے شام کو ذات شاہانہ کی موٹر آپ کو لینے کے لئے آئے گی، اور شام کے آٹھ بجے آپ کو اعلیٰحضرت کے حضور میں حاضر ہونا ہوگا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن پھر ٹیلیفون آیا۔ کہ اعلیٰحضرت نے خود یاد فرما کر حکم دیا ہے کہ آپ کل شام کے بدلے پرسوں شام آجائیں۔ کیونکہ ایک خاص مصروفیت کی وجہ سے اعلیٰحضرت ملاقات نہیں کر سکتے، تیسرے دن اعلیٰحضرت کی موٹر پہنچی۔ میں اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ ارک شاہی کے اندر مسلح فوجی پہریدار کھڑے تھے، ہماری موٹر اندر پہنچی تو انہوں نے سلام کیا، اب ہماری موٹر چیونٹی کی چال چل رہی تھی، میں حیران ہو گیا کہ موٹر کی چال اتنی سست کیوں ہو گئی، ڈرائیور بار بار اوپر کی



اعلحضرت همایون محمد ظاهر شاه بادشاه افغانستان

طرف دیکھتا تھا، میں نے بھی اس طرف دیکھا۔ تو ایک بہت بلند کلاک ٹاور نظر آیا، جس میں آٹھ بجنے میں تین منٹ باقی تھے، میں سمجھ گیا کہ ڈرائیور چاہتا ہے کہ میں ٹھیک وقت پر پہنچوں، نہ ایک منٹ آگے نہ ایک منٹ پیچھے، موٹر ایک حد پر جو اس کے لیے معین تھی کھڑی ہو گئی، اتنے میں ایک فوجی سپاہی دوڑتا ہوا آیا، اور اشارے سے ڈرائیور کو آگے بڑھنے کیلئے کہا، وہ موٹر کو لیکر قصر شاہی کے زینوں کے قریب پہنچ گیا، سردار محمد علی خان اور ایک فوجی افسر میری پیشوائی کے لئے حاضر تھے، ان دونوں نے اپنے بازوں کا سہارا دیکر مجھے موٹر سے اُتارا، ہم نے ایک دوسرے کو سلام کیا، چار کشادہ زینوں پر قالینوں کا فرش بچھا ہوا تھا، زینے کے ہر ایک کنارے پر سیاہ وردی میں ملبوس ایک ایک سپاہی کھڑا تھا، انہوں نے جھک کر ہمیں سلام کیا، اس سے آگے چار اور زینے تھے، جن پر سہارا دیکر انہوں نے مجھے چڑھایا، اور ایک کمرے میں بٹھا دیا، رئیس تشریفات

چلے گئے، اور میں اس فوجی افسر کے ساتھ بات چیت
میں مشغول ہوگیا، تین چار منٹ کے بعد افسر تشریفات
نے واپس آکر مجھ سے کہا۔ چلئے۔ میں ایک کمرے میں سے
ہو کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ تو دیکھا اعلیٰحضرت ہمایونی
وہاں کھڑے ہوئے تھے، میں نے سلام عرض کیا، وہ آگے
تشریف لائے۔ میں نے چاہا کہ اپنے بادشاہ اسلام کے
ہاتھ چوموں۔ انہوں نے نہیں چھوڑا۔ مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ اور
حسب دستورِ ملک میرا بوسہ لیا، میں نے بھی حضور کی پیروی
کی۔ ایک میز اور تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، حکم دیا کہ
بیٹھ جاؤ۔ اعلیٰحضرت خود بھی ایک کرسی پر تشریف فرما ہوئے
تیسری کرسی پر آپ کے داماد اور چچا زاد بھائی سردار محمد ولی خان
بیٹھ گئے، احوال پرسی کے بعد ارشاد فرمایا۔ کہ کتنی مدت کے
بعد اپنے وطن آنے کا اتفاق ہوا؟ میں نے کہا چھیاسٹھ سال
کے بعد۔ فرمایا۔ کچھ فرق نظر آیا؟ میں نے کہا دریائے کابل
کے سوا جو شہر کے اندر بہتا ہے۔ نیز کوہ آسامائی اور شیر دروازہ

کے بغیر میں کابل کو پہچان ہی نہیں سکا۔ سبحان اللہ کیا دیکھا
تھا اور اب کیا دیکھ رہا ہوں۔ شہر کابل میں جدید عمارتیں
اور راستے اس خوبصورتی سے تعمیر ہوئے ہیں کہ پرانے
کابل کا تصور تک دماغ میں نہیں آسکتا، فرمایا۔ کہ
ہاں۔ چند نئی عمارتیں چند جدید بازار اور راستے تعمیر
ہوئے ہیں۔ مگر شہر کی آبادی بڑھانے اور اسے پر رونق
بنانے کے متعلق جو کچھ خواہش ہمارے دل میں موجود
ہے وہ ابھی پوری نہیں ہوئی، ہم یہ چاہتے ہیں کہ
ہمارا ملک آباد اور ہماری قوم خوشحال ہو۔ عوام کو ہر قسم کی
فارغ البالی اور آرام میسّر ہو، مگر ابھی تک جو کچھ ہم کرنا
چاہتے تھے مکمل نہیں ہو سکا۔ یہ تمہارا ہی ملک تو ہے۔ تم
جانتے ہو۔ کہ اس غریب ملک میں ہم اپنی دلی خواہشات
کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے، تم بھی دعا کرو کہ خدا ہمیں
اپنے ارادوں میں کامیاب کرے، اور ہماری بہترین تمنائیں
جو ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لئے ہمارے دل

میں جاگزیں ہیں۔ پوری ہو جائیں۔

میں نے عرض کیا۔ کہ خدا ئے کارساز آپ کو کامیاب کریگا۔ اور آپ اپنے ارادوں کو پورا کر سکیں گے۔

اَلسّعی منّی والاتمام من اللّٰہِ۔

آپ نے فرمایا کہ یہاں کابل میں تمہارے اتنے دوست ہیں کہ ہر وقت تمہارا ہی ذکر ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے مزید پرسش حال کی ضرورت نہیں۔ پھر فرمایا کہ اتنی مدت تک تمہارا لہجہ کسطرح برقرار رہا۔ میں نے عرض کیا اعلیحضرت: مدتوں تک ہندوستان اور کشمیر میں قیام کیا۔ مگر بفحوائے

حُبّ الوطن من الایمان میرا جسم وہاں تھا اور روح اپنے وطن عزیز میں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنی مادری زبان فارسی میں کسی اور زبان کی آمیزش کر کے اسے مخلوط نہ کروں۔

ہنس کر۔ فرمایا۔ خوب:

اس کے بعد میں نے ایک قلمی کتاب جسے انگریزی فوج کے ایک جمعدار فدا حسین نے بطور روز نامچہ لکھا ہے اور جس میں افغانستان کی پہلی لڑائی ۱۸۳۹ء - ۴۲ کے واقعات، مثلاً انگریزوں کا شاہ شجاع کو اس کے سقوط سلطنت کے ۲۹ برس بعد لودھیانہ سے بلانا - فیروز پور میں شاہ شجاع، لارڈ اکلنڈ اور مہاراجہ رنجیت کے درمیان عہد نامہ مرتب ہونا - شاہ شجاع کی سندھ کی طرف روانگی امیران سندھ سے لڑائی، شاہ کا قندھار پہنچکر سرداروں سے لڑنا - فتح قندھار و غزنین شاہ کا کابل پہنچنا، امیر دوست محمد خان کی شکست اور اس کا بخارا کی طرف فرار - شاہ شجاع اور میکناٹن کا بمعہ سولہ ہزار گورہ فوج اور باقی ہندی فوج قتل انگریزوں کے خلاف کابل کے لوگوں کا بلوا - میرے عبدالاحد میر مسجدی خان غازی کا جہاد - اور موصوف کے واقعات شہادت، جن کی تصدیق میری تصنیف "نور کہستان" میں موجود ہے، من و عن درج کیے ہیں - اعلیٰ

حضرت کی خدمت میں پیش کی، اور عرض کیا کہ میں نے
اس کتاب کو جو اردو کی روزمرہ زبان میں کشمیری کاغذ پر
لکھی ہوئی ہے، لاہور میں دیکھا، چونکہ انگریزوں اور
افغانوں کی لڑائی کے حالات کے علاوہ اس کتاب
میں میرے جد امجد میر مسجدی خان کے جہاد کے واقعات
بھی درج تھے، میں نے اسے خرید لیا، مجھے معلوم ہے کہ
ذات شاہانہ کو علم و ہنر سے بے حد شغف حاصل ہے
میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس قدیم نسخے کو آپ جیسے
قدردان علم و معرفت کے حضور میں پیش کروں۔ یہ تحفہ ناچیز
سہی۔ مگر بقول۔ "پائے ملخے پیش سلیمان بردن عیب
است ولیکن ہنر است از مورے"۔ امید ہے کہ یہ
ناچیز تحفہ حضور جیسے معارف پرور بادشاہ کی خدمت
میں شرف قبولیت حاصل کرے گا، حضور نے کتاب
لے لی۔ اور فرمایا۔ میری نگاہ میں اس سے بہتر اور کوئی
تحفہ نہیں۔ میں اس سے بہت خوشنود ہوں۔

اس کے بعد حضور نے گھنٹی بجائی، رئیس تشریفات حاضر ہوئے۔ آپ نے کتاب اس کے حوالے کر کے فرمایا۔ جتنی جلدی ہو سکے، اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے جب رئیس صاحب چلے گئے تو میں نے کہا۔ کہ سردار محمد ولی خان بہت خوش مذاق ہے۔ فرمایا کیسے؟ عرض کیا۔ کہ جس وقت یہ اپنے والدِ بزرگوار والاحضرت سردار شاہ ولی خان اور اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ بخیریت یورپ کے دورے سے واپس تشریف لاکر گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں سرکاری مہمان کی حیثیت میں ٹھہرے تھے تو میں بھی ان کی پذیرائی کے لئے مقرر ہوا تھا۔ سردار محمد ولی خان نے اپنی والدہ محترمہ سے کہا کہ نور محمد شاہ نے اپنی کتاب نور کہستان میں آپ کے جدامجد اعلیحضرت امیر عبدالرحمٰن مرحوم کو گالیاں دی ہیں، ان کی والدہ محترمہ نے میری طرف دیکھکر فرمایا۔ کہ نہیں نہیں یہ مناسب نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا۔ کہ خدا نہ کرے کہ میں کسی کو گالیاں دوں۔ یا برُا بھلا کہوں۔ البتہ میں

نے آپ کے عہد حکومت کے واقعات لکھے ہیں، میں یہ بھی نہ لکھتا۔ مگر یہ سمجھ کر لکھا کہ آنیوالے بادشاہ اور حکمران ان واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ اور بس۔

اعلیٰحضرت سردار موصوف کی طرف دیکھکر ہنس پڑے سردار صاحب بھی مسکرائے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ میں اعلیٰحضرت شہید کے مرقد کی زیارت کے لئے گیا تھا مگر فوجی پہرہ دار نے مجھے زیارت کرنے کی اجازت نہیں دی میں نے بہت اصرار کیا۔ مگر وہ یہی کہتا رہا کہ حکومت کی طرف سے اجازت نہیں۔ میں کیا کروں۔ . . .

اس لئے مجبوراً میں واپس آگیا۔

اعلیٰحضرت نے فرمایا کہ گنبد کا کام جاری ہے۔ خاک دھول اڑ رہی ہے۔ اس لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی باہر کا آدمی شاہ شہید کی زیارت کے لئے آئے تو اسے چاہیئے کہ پہلے اطلاع دے، تاکہ کام بند ہو جائے، اور وہ زیارت سے مشرف ہو۔ میں نے عرض کیا۔ کہ کل میں نے والاحضرت شاہ

ولی خان کو ٹیلیفون کیا تھا۔ کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا۔ کہ والاحضرت فرماتے ہیں کہ میری طبیعت اچھی نہیں، شب خوابی کے لباس میں ہوں۔ اگر آپ مجھے اسی لباس میں دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ ضرور تشریف لائیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مہربانی فرما کر خوش آمدید کہا۔ اور میں بیٹھ گیا، والا حضرت نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ میں آپ کو دیکھنے کے لئے آرہا تھا۔ نہ کہ آپ کے کوٹ و پتلون دیکھنے کے لئے۔ مجھے معلوم ہے کہ خدا نے آپ کو سینکڑوں سوٹ دیئے ہیں۔ آپ ہنس پڑے اور پھر خوش آمدید کہا۔ میں نے یہ بات ختم کر کے اعلیٰحضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ اعلیٰحضرت شہید کے مرقد مبارک کی بھی یہی مثال ہے۔ میں زیارت کے لئے گیا تھا۔ اگر وہاں گرد و غبار تھا تو کیا ہوا پشاور سے کابل تک اتنی خاک چھان چکا ہوں کہ اگر اعلیٰ حضرت شہید کے مرقد مبارک کی خاک کی ایک دو مٹھیاں

بھی پھانک لوں۔ تو اس میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا
آپ نے گھنٹی بجائی رئیس تشریف آئے۔ حکم دیا کہ صاحبزادہ
جس وقت چاہے، آپ اسے ہماری موٹر میں بٹھا کر اور ایک فوجی
افسر کو رہنمائی کے لئے ان کے ساتھ کر کے اعلیٰحضرت شہید کے
مرقد تک پہنچا دیں۔ میں نے شکریہ ادا کر کے عرض کیا۔ کہ کتابوں
اور روزناموں میں اعلیٰحضرت کا فوٹو شائع ہوتا رہتا ہے، میں
بھی چاہتا ہوں کہ ذات شاہانہ کا ایک فوٹو مجھے دیا جائے
تاکہ اس یادگار ملاقات کی یاد تازہ رکھنے کے لئے میں اسے
کمرے میں رکھوں۔ اور اسے اپنی عزت افزائی کا ذریعہ
سمجھوں۔ گھنٹی بجائی، رئیس تشریف آئے تو آپ نے
حکم دیا کہ ہمارا ایک فوٹو صاحبزادہ کو دیدو۔ پھر فرمایا۔ تجھے اپنے
ملک اور جائیداد کے دیکھنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے، جہاں
کہیں جانا چاہو جاسکتے ہو۔ عرض کیا۔ خدا آپ کا سایہ ہمیشہ
قائم رکھے، اس کے علاوہ کچھ اور گفتگو بھی ہوئی ہوگی۔ آخر میں
فرمایا کہ کچھ دن اور یہاں ٹھہرو۔ جلدی واپس جانے کی ضرورت

نہیں، میں نے کہا بہت اچھا، میں نے کہا میرے دل میں یہی آرزو تھی کہ میں اپنے وطن اور عزیز و اقارب کو دیکھ سکوں شکر ہے کہ خدا نے میری یہ آرزو پوری کردی۔ یہ ملاقات چالیس منٹ تک جاری رہی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے اعلیحضرت کا کافی وقت لے لیا ہے، اب رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ کھڑے ہو کر فرمایا۔ کہ ہم آپ کو دیکھنے سے بہت خوش ہوئے۔ یہ ہماری اور آپ کی آخری ملاقات نہیں۔ پھر بھی کبھی ملاقات کریں گے، میں نے عرض کیا آپ جس وقت حکم دیں گے، میں حاضر ہو جاؤں گا، اور اس کو اپنی سعادت، خوش بختی اور افتخار کا ذریعہ سمجھوں گا، اس کے بعد خدا حافظ کہکر میں رخصت ہو گیا،

تین چار دن کے بعد رئیس تشریفات شاہی کا ٹیلیفون آیا کہ میں خود آپ کے پاس آتا لیکن مناسب یہی ہے۔ کہ آپ میرے ہاں تشریف لا کر چائے نوش فرمائیں، میں نے یہ دعوت قبول کی، عصرانہ نہایت پر تکلف تھا، چائے پینے

کے دوران میں ڈیرہ دون کے زمانہ کی باتیں اور آپ کے
والد مرحوم سردار محمد موسیٰ خان اور والدہ مرحومہ کا ذکر ہوتا رہا۔
آخر میں رئیس صاحب نے اعلیٰحضرت کا ایک فریم شدہ
فوٹو لاکر مجھے دیا، کہ یہ فوٹو اعلیٰحضرت نے آپ کے لئے مرحمت
فرمایا ہے۔ میں نے شکریہ ادا کر کے کہا کہ میری طرف سے اعلیٰحضرت
کی خدمت میں ممنونیت کا پیغام عرض کر دیتا،

اکثر اوقات والاحضرت فیلڈ مارشل سردار شاہ محمود خان
غازی کی خدمت میں گلباغ میں حاضر ہوتا، مہربانی فرماتے
اور مجھے اپنے ہمراہ موٹر میں لے جاتے، چائے پیتے..
گفتگو کرتے اور شام کو مجھے سفیر صاحب کے گھر پہنچا دیتے
اس محفل میں ہر قسم کی باتیں۔ گفتہ و شنیدہ معرض
بیان میں آتیں، آپ بہت خلیق شریف اور ملنسار انسان
ہیں۔ بحیثیت مجموعی اس خاندان کے تمام افراد بہت متواضع
منکسر المزاج، نیک کردار اور صاحب اتفاق ہیں، کئی پشتوں
سے آج تک ان کا ایک ہی وطیرہ ہے، ان کی ان ہی



اعلحضرت محمد نادر شاه شهید و والا حضرتین
سردار شاه ولی خان غازی و سردار شاه محمود خان
غازی

خوبیوں نے انہیں تخت شاہی کا وارث بنا دیا ہے، اور جب تک یہ خوبیاں ان میں باقی ہیں یہ لوگ برقرار اور بامراد رہیں گے انشاء اللہ۔

والاحضرت شاہ ولی خان بھی نہایت علم دوست اور با اخلاق شخص ہیں۔ اکثر میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اور ملاقات کرکے رخصت ہوتا جس وقت میں نے پاکستان واپس آنے کا ارادہ کیا تو میں نے پغمان میں انہیں ٹیلیفون پر اطلاع دیکر جانے کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا۔ میں خود آپ کو رخصت کرنے کے لئے آتا۔ لیکن میرے پاؤں میں درد ہے، میں اپنی موٹر بھیجتا ہوں۔ آپ مہربانی کرکے پغمان چلے آئیں، ان کی موٹر آئی تو میں اس پر بیٹھکر ایک جدید زیر ساخت راستہ سے پغمان پہنچا، آپ نے نہایت مہربانی کا اظہار فرمایا، چمن میں بیٹھکر ہم نے چائے پی، آپ کے فرزند ارجمند سردار عبد الولی خان بھی تشریف فرما تھے، دو گھنٹہ تک یہ محفل جاری رہی۔ بالاخر میں نے اجازت چاہی

آپ نے خدا حافظ کہہ کر مجھے رخصت کیا، رخصت کے وقت فرمایا۔ پھر بھی کبھی افغانستان آنا، تم اپنے وطن اور اپنی قوم کو دیکھکر خوش ہوتے ہو، اور ہم تمہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اسی طرح سردار محمد نعیم جان وزیر خارجہ سے بھی دو مرتبہ ملاقات ہوئی، چائے کی دعوت میں ایک گھنٹہ تک بات چیت کر کے رخصت ہوتا رہا۔ آپ نہایت عقلمند ہنس مکھ باذاق اور سیاسیات حاضرہ سے باخبر انسان ہیں۔ اسی طرح باقی وزرا اور مشہور سوداگروں سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں، یہ سب کے سب مہربانی فرماتے اور دعوتیں دیتے تھے، مگر ان تمام ملاقاتوں میں پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کے بارے میں۔ ایک حرف بھی درمیان میں نہیں آتا تھا، میں افغانستان کے گذشتہ حالات و واقعات بیان کرتا اور لوگ تعجب اور دلچسپی سے سنتے۔ نوجوان تعجب کرتے تھے، اور لطف اُٹھاتے تھے، ایک دن اجازت لیکر میں اعلیحضرت امیر عبدالرحمن

خان مرحوم کے تعمیر کردہ ارک میں گیا۔ جس کے اکثر حصوں میں اب دفتر بنے ہوئے ہیں۔ سابقہ سلام خانے میں گیا جہاں اس وقت مجلسِ شورایٰ قائم ہوتی ہے۔ رئیس مجلس آقائے نوروز خان اور دیگر اعضائے مجلس نے بے حد پذیرائی کی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس جگہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ جہاں کھڑکی کے پاس اعلیٰحضرت امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم آرام کرسی پر تشریف فرما ہو کر دربار منعقد کرتے تھے اور میں دس برس سے بارہ برس کی عمر تک ان کی کرسی کے نیچے بیٹھا کرتا تھا۔ امیر صاحب مرحوم کی کرسی کے عقب میں چند خوبصورت نورستانی، ترکستانی اور بدخشانی نوجوان جو غلام بچے کہلاتے تھے، کھڑے ہوتے۔ ان کا لباس تھا کوٹ پتلون سیاہ، سر پر قراقلی کی ٹوپی۔ کمر بند باندھے ہوئے جن پر چاندی کے قبے لگے ہوئے۔ ان میں سے اکثر کا نام مجھے یاد ہے، مثلاً ملک سعید۔ محمد نعیم جان، ناظر، صفر وغیرہ اسی قسم کے دیگر غلام بچے اسی لباس میں ملبوس دربار کے مختلف حصوں میں اہل دربار کو چائے پیش کرنے یا بلوریں چلموں میں تمباکو پلانے پر مامور تھے۔

سلام خانے میں ساٹھ گز لمبے اور ۳۰ گز چوڑے قالین کا فرش بچھا ہوتا

ہوتا تھا - اہلِ دربار اپنی اپنی حیثیت اور اپنے اپنے منصب کے مطابق سب مراتب بیٹھتے تھے - تمام سلام خانہ بھرا ہوا تھا - اعلیحضرت کے نزدیک بیٹھنے والوں میں سردار شمس الدین خان، خان ملا خان، قاضی عبدالرحمن، محمد یوسف خان، سردار محمد عظیم خان عموہائے محترم اعلیحضرت میر نبی خان - میرے والد صاحب مرحوم میر کولاب وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں - شاہ آغا علی محمد سرور خان عصائے طلائی ہاتھ میں بطور وزیر دربار اور نائب سلطان کوتوال وغیرہ کھڑے رہتے - اعلیحضرت کی کرسی کے پاس دالی کھڑکی کے نیچے عرض بیگی باریش حنائی، وکیل عمومی جنرل عطا محمد خان نائب سالار امیر محمد خان چند فوجی افسر - فوجی سپاہی - اور چوبدار، برق شاطر - کوٹ ورجس کمخواب میں ملبوس طلائی تبر شانے پر رکھے چند شاطروں کیساتھ موجود - بارہ راس اسپ یدک با ساز و یراق طلائی استادہ ......

اب میں نے اس مقام کو دیکھا ان لوگوں میں سے میرے بغیر ایک بھی موجود نہیں تھا ؎

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید ؎ زجام دہر مے کل من علیہا فان

دل پر جو کیف طاری ہوئی اسے نہ میں بیان کرسکتا ہوں نہ ناظرین کتاب ہذا اسے سمجھ سکتے ہیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ؎ خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہوگئیں

اس سلام خانہ کا ذکر کتاب نور کہستان میں آیا ہے - ناظرین ملاحظہ فرما سکتے ہیں - عید کے دن ٹیلیفون کے ذریعہ والاحضرت شاہ ولی خان کی خدمت میں عید مبارک کا پیغام عرض کیا - جواب

آیا کہ بعد از ادائے فریضۂ نماز عید سعید کی تقریب ہیں میرے پاس بہت سے فوجی افسر اور ماموریں دولت تشریف فرما ہیں۔ آپ بھی آجائیں کہ یہ لوگ آپ کے مشتاق دیدار رہیں۔ میں نے عرض کیا۔ بہت خوب حاضر ہوتا ہوں۔ والاحضرت کی موٹر آئی۔ میں اس پر بیٹھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تخمیناً چالیس ذوات محترم وہاں موجود تھے۔ سب نے اٹھکر میری پذیرائی کی۔ والاحضرت ایک ایک کا تعارف مجھ سے کراتے تھے۔ میں نے بھی ان کے باپ دادوں کے نام کی مناسبت سے انہیں پہچان کر احوال پرسی کی۔ کچھ دیر تک یہ دلچسپ محفل جاری رہی۔ مہمان رخصت ہوئے تو میں نے تھوڑی دیر تک والاحضرت سے ملاقات اور اختلاط کر کے رخصت حاصل کی۔ میرے ایک دوست محترم کرنل عبداللہ شاہ ملٹری اٹاچی سفارت خانہ پاکستان نے میرے لئے ایک جیپ کا انتظام کیا تھا۔ میں اسی امریکانی جیپ میں بیٹھ کر چار

عہد شہنشاہ اورنگ زیب میں ایک ہندو فارسی کا شاعر تخلص برہمن کا ایک فرد تھا۔ کہ

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندین بار
بہ کعبہ میبروم و بازش برہمن آوردم

اورنگ زیب نے سنا حکم دیا۔ کہ اس کافر کو قتل کیا جائے۔ نعمت خان عالی نے عرض کی کہ اس نے شیخ سعدیؒ کی پیروی کی ہے۔

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود ٭ چون بیاید ہنوز خر باشد

اورنگ زیب نے حکم دیا۔ کہ معاف ہے اور کچھ انعام بھی دیا۔

بجے بعد دوپہر سب کو خدا حافظ کہہ کر کابل سے پشاور کی طرف روانہ ہوا۔

کابل سے پشاور تک کا سفر

تنگ غارو کا راستہ زیر تعمیر اور بے حد خراب ہے۔ اس پر کام جاری ہے۔ مشینوں اور انجنوں کے ذریعے ڈائنامیٹ لگا کر چٹانوں کو اڑایا جا رہا ہے، اور پہاڑوں میں سرنگیں کھودی جا رہی ہیں۔ ہزاروں مزدور کام پر لگے ہوئے ہیں ان کی وردی اور ٹوپی خاکی رنگ کی ہے، دو ایک میل کے فاصلہ پر ان کے کیمپ لگے ہوئے ہیں، جن میں فوجی سپاہیوں جیسے خیمے نصب کئے ہیں۔ یہ لوگ رات بھر ان خیموں میں آرام کرتے ہیں۔ اور صبح اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، راستہ طے کرنے کے دوران میں ہم نے کئی بار بڑے بڑے پتھروں کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا، یہ راستہ دریا کے کنارے کنارے

چلا جا رہا ہے، دونوں طرف اونچے، کالے اور بے برگ وگیاہ پہاڑ سر اُٹھائے ہوئے کھڑے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے تین گھنٹے کے عرصہ میں موٹر نے پچاس میل کا راستہ طے کیا، اور ہم شام کے سات بجے سروبی کے ہوٹل میں پہنچے،

ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم رات قونصل خانہ پاکستان جلال آباد میں بسر کریں گے، جلال آباد کا قونصلر بشیر محمد خان نے جو میرا دوست ہے ہمارے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن میں بے حد تھک چکا تھا، سروبی سے آگے سفر کرنے کے قابل نہیں تھا، میں نے ٹیلیفون کے ذریعے بشیر محمد خان کو اطلاع دی کہ میں صبح جلال آباد پہنچوں گا۔ سروبی سے جلال آباد تک یہ ساٹھ میل کا فاصلہ ہے، سروبی کا ہوٹل سرکاری ہوٹل ہے، نہایت صاف اور ستھرا ہوٹل ہے جس میں حد درجہ آرام دہ بستر ے، صاف برتن آراستہ شب خوابی کے کمرے، اور غسلخانے موجود ہیں۔ یہ ہوٹل

کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کا منظر دید کے قابل ہے۔
اگرچہ ہوٹل کے منتظم کو ہمارے آنے کی اطلاع نہیں تھی پھر بھی اس نے رات کے کھانے کا بہترین انتظام کیا تھا، رات بھر آرام کی نیند سویا، صبح چائے پینے کے بعد۔ جلال آباد کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے جلال آباد کے شہر کو ۶۸ سال قبل دیکھا تھا، اس وقت یہاں ایک پرانا بازار تھا، اور ایک عمارت چل ستون۔ اسی کے ساتھ سردار غلام حیدر خان کے باغات اور پرانی عمارتیں بھی تھیں۔ اب یہ شہر نئے سرے سے آباد ہوا ہے، اس زمانے میں ہم لوگ دریا کے کنارے خیموں میں قیام کرتے تھے، اور اعلیحضرت امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم حرم شاہی کے ساتھ غلام حیدر خان کی پرانی عمارت میں فروکش ہوتے تھے، اعلیحضرت چل ستون کے ایک پرانے بالا خانہ میں دربار آراستہ کرتے تھے، سروبی سے جلال آباد تک سڑک کچھ بہتر تھی اور اس پر کام جاری تھا، جلال آباد کے شہر کو سلطان جلال الدین خلجی نے تعمیر کیا تھا، یہ شہر نہایت

گرم اور مچھروں اور مکھیوں سے پر تھا۔ کسی شاعر نے اس کی شان میں کیا خوب کہا تھا، کہ

خوش عجب شہرے بنا کردہ۔ جلال بوالہوس
در زمستان کان باد و در بہار کان مگس

جلال آباد کے بازار کی سیر کی۔ دو درجن میٹھے اور لذیذ خربوزے خریدے، اور وکہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہم کابل سے سروبی کی طرف آرہے تھے، راستے میں دو نفر مزدور چلے آرہے تھے۔ جن کے پاس دو بڑے بڑے تربوز تھے میں نے جیپ ٹھہرا کر ان سے پوچھا کہ سپاہی ملا عمر آگے ہیں یا پیچھے رہ گئے ہیں، انہوں نے کہا۔ وہ اس راستے میں واقع نہیں، وہ کوتل لتہ بند کی راہ میں واقع ہیں۔ یہ کہہ کر ان میں سے ایک نے ایک تربوز پیش کر کے کہا کہ یہ آپ کی مہمانی ہے۔ میں نے ہر چند انکار کیا۔ مگر وہ نہیں مانے اور کہا کہ اگر آپ ہمارا یہ تحفہ قبول نہیں کریں گے تو ہم ناراض ہو جائیں گے۔ میں نے ان کی دلجوئی کے پیش نظر یہ تحفہ قبول

کر لیا۔ اور دل میں بے حد خوش ہوا کہ الحمد للہ ہماری قوم میں مہمان نوازی کا وہی شریف جذبہ اب تک موجود ہے اسی طرح کتاب "نور کہستان" میں میں نے ملک مراد خان کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کا ذکر کیا ہے جس نے جانے بوجھے بغیر ہماری پذیرائی کی تھی ۔ ان واقعات کے دہرانے سے ایک قوم کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا حال معلوم ہو جاتا ہے ۔ بقول حضرت شیخ سعدی ،

چو از قومے یکے بے دانشی کرد ۔ نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را
نہ مے بینی کہ گاوے در علف زار ۔ بیالاید ہم گاوان دہ را

جلال آباد سے تورخم تک ایک بے آب و گیاہ ریگ زار ہے ۔ اگرچہ سڑک پر تارکول نہیں بچھایا گیا ۔ پھر بھی راستہ صاف اور ہموار ہے ۔ تورخم یعنی سرحد پاکستان سے پشاور تک سڑک حد درجہ خوبصورت اور صاف ہے جس کا شمار دنیا کی بہترین سڑکوں میں ہے دوپہر کے ایک بجے ہم پشاور پہنچے

سردار عبدالرشید خان کی شرافت

چند یوم قبل میں برخوردار محمد ظفر خان ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد کے ہاں رات کی دعوت پر مدعو تھا، مسٹر فاروقی C.S.P قونصلر پاکستان مقیم قندہار بھی جو سیاحت افغانستان میں ہمارے ساتھ تھے، اس دعوت میں موجود تھے، گفتگو کے دوران میں۔ میں نے فاروقی صاحب سے دریافت کیا کہ سردار عبدالرشید خان کراچی سے براہ راست کابل کیوں تشریف نہیں لے گئے، انہوں نے جواب دیا کہ وہ مخصوصاً آپ کو ساتھ لے کر کابل جانے کے لئے پشاور تشریف لائے تھے،

سردار عبدالرشید خان کی شرافتوں کا حال مجھے پہلے ہی معلوم تھا، مگر آپ کے اس موجودہ رویہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اور آپ کی عزت میری نظروں میں بے حد بڑھ گئی۔ اس لئے کہ افغانستان کی سیاحت کے دوران

میں موصوف نے ایک دفعہ بھی اپنے اس احسان کا ذکر نہیں کیا، تاکہ میں ان کے زیر بار منت نہ ہو جاؤں، اتفاقاً فاروقی صاحب سے مجھے اس بات کا پتہ چل گیا۔ دنیا میں اس قسم کے لوگ بھی موجود ہیں، اور اس قسم کے بھی کہ اگر کسی کو روٹی کا ایک نوالہ بھی دیا تو ہزار بار اسے یاد کیا،

کہ یک جو منت دو نان بصد من زر نمے آرزد

سردار عبدالرشید خان اور نواب مظفر علی خان قزلباش کے خاندانی حالات

سردار عبدالرشید خان کے آباؤ اجداد گل درہ علاقہ کوہستان کے شرفائے نجبا میں سے تھے، یہ دونو بھائی تھے، سردار احمد میر خان - اور سردار میر احمد خان - یہ دونو بھائی سدوزئی دور حکومت میں فوجی افسر تھے، شاہ شجاع کے قتل کے بعد ۱۸۴۲ء میں یہ دونوں بھائی اپنے اہل وعیال کے کیساتھ

ہندوستان آئے۔ شاہ شجاع کا خاندان اپنی پرانی جائے قیام یعنی لدھیانہ میں مقیم ہوئے، اور یہ دونو بھائی پشاور ہیں رہ گئے، ان کی اولاد نے انگریزی دور حکومت میں تعلیم حاصل کی۔ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے، موجودہ دور میں یہ خاندان پاکستان کا ایک معزز گھرانہ خیال کیا جاتا ہے،

اسیطرح لاہور کا قزلباش خاندان بھی افغانستان کا معزز خاندان ہے۔ احمد شاہ غازی کے عہد حکومت میں ان کے آباؤ اجداد بڑے بڑے عہدوں پر متمکن تھے ان کا جد اوّل احمد شاہ غازی کی فوجوں کا سپہ سالار تھا یہ خاندان بھی ۱۸۴۲ء میں لاہور آکر مقیم ہوا۔ انگریزی حکومت نے بھی ان کی پذیرائی کر کے انہیں ایک جاگیر لاہور میں۔ اور ایک بڑا علاقہ یوپی میں عطا کر دیا۔ ان کا جدّ اول لاہور میں نواب ناصر علیخان۔ اس کا بیٹا نوازش علیخان۔ اس کا بیٹا نواب فتح خان۔ اس کا بیٹا نواب ناصر علی خان دوم اور اس کا فرزند ارجمند نواب مظفر علی خان وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان۔

یہ خاندان بہت مخیر ہے، لاہور میں کئی سرائیں امام باڑے اور اوقاف کی جائدادیں بنوائی ہیں۔ جن کی سالانہ آمدنی غریب بیواؤں اور مستحق طلباء میں تقسیم کی جاتی ہے، اسی طرح سردار یار محمد خان پوپلزئی کا خاندان بھی سنہ ۱۸۴۲ء میں گجرات میں مقیم ہوا۔ جو اب تک برسر اقتدار رہے، ایک اور خاندان بلند شہر یوپی میں مقیم ہوا، جن کی اولاد اب بھی سرکاری ملازمت اور جاگیرداری کے ذریعے آرام اور عزت کی زندگی بسر کر رہی ہے، یہ تمام خاندان سدوزئیوں کے سقوطِ سلطنت اور محمدزئی خاندان کے اقتدار کے بعد ترک وطن کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے،

پیشرفت روس

قیام افغانستان کے دوران میں دیگر مفید تجربوں کے علاوہ جو بات مجھ پر واضح ہو گئی۔ وہ یہ ہے کہ افغانستان کے باشندے روس کی طرف زیادہ مائل ہیں جس کی چند وجوہات ہیں،

۱۔ روسی حکومت۔ افغانستان کے لوگوں سے کابل سے روس تک ہوائی جہاز کا کرایہ بہت کم وصول کرتی ہے

۲۔ روس کے شفاخانوں میں افغان مریضوں سے علاج معالجہ کے سلسلہ میں دوائیوں کی قیمتیں نسبتاً ارزاں وصول کی جاتی ہیں،

۳۔ کابل کے لوگوں کی سہولت کے لئے روسیوں نے انگریزی سفارت خانے کے قریب ایک مشین نصب کی ہے۔ جو گندم کو صاف کر کے اس سے آٹا پیستی ہے،

۴۔ روسیوں نے افغانستان میں پٹرول کی قیمت کم کردی ہے
افغانستان کے عوام اور خواص بالخصوص تجار طبقہ

پاکستان کے ساتھ حد درجہ محبت کرتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان کے عوام کے لئے خیر سگالی اور اسلامی اخوت کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ۔

۱۔ حکومت پاکستان خارجہ ممالک سے افغانستان میں اس درآمد شدہ مال پر محصول وصول نہیں کرتی جو پاکستان کے راستے جاتا ہے،

۲۔ سرحد پاکستان سے جو بار برداری کے ٹرک افغانستان جاتے تھے۔ ان کی آمد ورفت کے جھگڑے کو پاکستان نے حکومت افغانستان کی منشا کے مطابق طے کیا،

یہ وہ مراعات ہیں۔ جنہیں افغانستان کی حکومت اور وہاں کے لوگ دونوں محسوس کرتے ہیں۔

حجاز سے دوست محترم سردار فیض محمد خان کا پیغام

سیاحت افغانستان کے آخری دنوں میں دوست محترم سردار فیض محمد خان سفیر کبیر دولت افغانستان مقیم سعودی عرب کا پیغام مجھے پہنچا کہ میں دو ہفتہ کے بعد کابل آجاؤں گا۔ آپ میرے آنے تک کابل ہی میں ٹھہریں، میں آپ کی ملاقات کا بے حد خواہشمند ہوں میری یہی آرزو ہے کہ آپ چند روز میرے ہاں بطور مہمان تشریف رکھیں، اور ہمیں اپنے لطف صحبت سے محظوظ فرمائیں"

اسی طرح اور بہت سے احباب کی یہی خواہش تھی کہ میں چند روز اور ٹھہر جاؤں، مگر افسوس ہے کہ میں اپنا پروگرام ملتوی نہ کرسکا، اور سردار صاحب موصوف کے شرف نیاز سے محروم رہا۔ خیر ؎

یار زندہ صحبت باقی۔

والاحضرت شاہ ولی خان غازی کے دو نادر تحائف

والاحضرت شاہ ولی خان غازی نے کمال لطف وعنایت سے دو کتابیں تحفۃً مجھے ارسال کی ہیں،
ایک کتاب موسوم بہ (یادداشت ہائے خود) اس کتاب میں والاحضرت کی اس جد وجہد کی یادداشتیں درج ہیں جو موصوف کی طرف سے حبیب اللہ المعروف بہ بچہ سقہ کے پنجۂ استبداد سے وطن عزیز کو نجات دینے کے سلسلہ میں عمل میں آئی تھیں۔

دوسری کتاب موسوم بہ جنگ نامہ جو مثنوی کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کی قہرمانی فوجوں کے خلاف میرے جد امجد میر مسجدی خان غازی و شہید کے حالات جہاد درج ہیں، جس میں موصوف نے پہلی جنگ آزادی کا آغاز کر کے اغیار کے پنجے سے ملک وملت کی نجات کی بنیاد قائم کی۔ اس مثنوی کا مصنف مسمّی

غلامی دیہہ قاضی (کوہستان) کا باشندہ ہے جوان محاربات
میں موجود تھا۔ ایک سو پندرہ برس کے بعد یہ کتاب کاغذ
کے مختلف پرزوں پر بطور یادداشت لکھی ہوئی ایک کسان
کے گھر سے برآمد ہوئی۔ اور محمد حسن خان کے ہاتھوں تک
پہنچی۔ موصوف نے ان پرزوں کو انجمن، تاریخ افغانستان کے
حوالے کیا، انہوں نے ایک مجاہد وطن کے چشم دید حالات
کو قدر کی نگاہ سے دیکھکر ملت غیور افغانستان کے افادہ
کے لئے اسے کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔
تاکہ موجودہ نوجوانان وطن اپنے اجداد کی قربانیوں کو مشعل
راہ بنا کر اس کی روشنی میں خود بھی منزل ترقی کی طرف گامزن
ہوں۔ نیز دنیا والوں پر بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جن
قابل قدر ہستیوں نے وطن کی آزادی کی راہ میں بے لوث
قربانیاں دیں۔ دنیا اب بھی ان کی خدمت میں خراج
تحسین پیش کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جنہوں نے شخصی
اغراض و مقاصد کے پیش نظر وطن سے غداری کی اور چند سنہری

اور روپہلی سکوں کے بدلے ملک وملت کے ناموس کو فروخت کر دیا۔ آنے والی نسلیں نفرت وحقارت سے ان کا نام لیتی ہیں۔ سچ ہے وطن دشمنی کی روسیاہی اور بدنامی کا داغ صدیاں گذرنے کے بعد بھی غداران وطن کی پیشانیوں سے دھل نہیں سکتے، اگر ایک طرف دنیا والے محبان ملک وملت کی روحوں پر رحمت بھیجتے ہیں تو دوسری طرف دشمنان قوم وملت کو لعنت اور نفرین سے یاد کرتے ہیں۔

نہ دولت کو ہمیشہ کے لئے قیام حاصل ہے۔ نہ جاہ وجلال کو۔ البتہ، نیک کے لئے "تحسین" اور بد کے لئے "نفرین" کی یاد قیامت تک باقی رہیگی،

بقول۔ قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت

نوشیرواں نمرد کہ نام نکو گذاشت؟

نماند ستمگار بد روزگار؟

بماند برو لعنت پائیدار

شُلے نام زشتش بود یادگار!

اس سے قبل میں نے اسکندر مرزا سے کہا تھا کہ سیاسی

لیڈروں کی باہمی کشمکش اور وزیروں کی بے اتفاقی و خود غرضی سے پاکستان کا سلطنتی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ اس وقت ملک کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ موجودہ جمہوریت کی غلط طرزِ حکومت کو تبدیل کر کے ملک کی عنانِ اختیار ایک ہاتھ میں دے دینی چاہیئے۔ دوسری دفعہ جرنیل محمد ایوب خان کے بنگلہ پر ان کے سامنے میں نے اسی بات پر اصرار کیا۔ مگر مرزا صاحب میری اس بات کو ہنسی میں ٹال گئے۔

چنانچہ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنے والا تھا۔ اگر مرزا صاحب نے یہ رباعی سنی ہوتی تو وہ یقیناً سوچ بچار کرتے، کہ تمام دنیا تو میری طرزِ حکمرانی کو سراہتی ہے۔ اور یہ ایک ہیچمدان شخص اس پر معترض ہے، تو کیوں؟ پھر وہ مجھ سے اسکی تفصیل پوچھتے۔ اور غور و فکر سے کام لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ رباعی یہ ہے

نگویند از سر بازیچہ حرفے
کزو پندے نگیرد صاحب ہوش
اگر صد باب حکمت پیش نادان
بگوئی آیدش بازیچہ در گوش

کابل کے مشہور شاعر عفتؔ کا قصیدہ جو موصوف نے اعلیٰ حضرت امیر شیر علی خان کے فرزند سردار عبداللہ جان کی ولیعہدی کے جشن کے موقع پر لکھا تھا۔

اپنی حکومت کے دوران میں اعلیٰحضرت امیر شیر علیخان مرحوم فرمانروائے دولت افغانستان نے اپنے چھوٹے فرزند سردار عبداللہ جان کو جس کی عمر بارہ سال تھی، ایک عظیم الشان جشن مرتب کر کے اپنا ولیعہد مقرر کیا تھا۔ اس تقریب سعید کے موقع پر کابل کے مشہور شاعر عفتؔ نے ایک قصیدہ لکھا تھا۔ راقم الحروف نے سترہ سال کی عمر میں وہ قصیدہ سنا تھا جس کے چند اشعار اب تک نہانخانہ حافظ میں محفوظ ہیں۔ محترم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے وہ اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

شبے زمحنت ایام و دوری دلبر ٭ طپیدمے چو دل ناصبور بر بستر
چہ شب چہ روز قیامت دراز و وحشتناک ٭ کہ با ہزار مصیبت نمی رسید بسر
گہے بسقف ثریا ہمے کشیدم آہ ٭ گہے بحسرت دگر دست مے زدم بر سر

رسید تا به کمر بود. زلف شاهد شب ؞ که در رسید بگوشم صدای حلقهٔ در
شدم که باز کشایم در سرا تا کیست. ؞ که می زند در این بی نوا به این حنجر
در سرا چو گشودم نگار را دیدم ؞ ز بادهٔ عنبی رخ چو لالهٔ احمر
در آمد از در غم خانه ام شگفته چو گل ؞ صنم عذار بتی لاله روی و مه پیکر
ستاده گفت: الا زود باش و در بر بند ؞ که مدعی نشود از درون خانه خبر
در سرا بزدم قفل. پس بهم رفتیم ؛ ؞ خرد ز همرهی ام باز ماند و در پس در
شدیم تا در حجره هر دو دست به دست ؞ درون خانه شد آن ماه و من برون از در
ز بهر خدمت او بنده وار استادم ؞ شکسته دامن خدمت چو خادمان به کمر
نشست و کرد برون از بغل بطی پر می ؞ بصد کرشمه بنوشید یک دو سه ساغر
نشسته گفت، چه استادهٔ بیا بنشین ؞ که وقت عیش بهار است می زود نظر
دمی بهم بنشینیم و یک دو دم نوشیم ؞ که اعتماد دمی نیست تا دمی دیگر
دو دست خویش حمائل بگردنش کردم ؞ ببر گرفته بگفتم مرا مده ساغر
خراب بادهٔ لعل توام. سرت گردم ؞ که نیست همسر لعل تو بادهٔ احمر
بخنده گفت، که این هر دو چیز موجود است ؞ بنوش باده و از لعل ناب بهره ببر
سرش چو گرم شد از بادهٔ طرب آن دم ؞ بخواند این غزل تازه با نوا از بر!

غزل!

رسید موسم گل بساغر گلاب بیار   ہوا ز نکہت مے مست شد شراب بیار
بنوش بادہ کہ پاسے ز شب بود باقی   بہ پاس صحبت یاران شراب ناب بیار
غزل سرائے کہ تا صبح مجلس آرائیم   بیار بربط و دف مطربا شتاب بیار
رُخ چو ماہ بپوش از من غرا باقی!   بکف ایاغ و بہ پیمانہ آفتاب بیار
فدائے چشم سیاہ تو گردم اے ساقی   دوائے درد دل عفت خراب بیار

دو چشم بر رخ نیکش کشودہ می دیدم   کہ شد جبین فلک روشن از ضیائے سحر
صدائے نوبت و نقارہ ام رسید بگوش   سبک ز جائے برون جستہ و کشودم در
چہ منظرے بنظر آمدم نشاط انگیز   ندیدہ چشم فلک ہیچ گاہ این منظر!
ز رہ ہر دمے چو بپرسیدم این چہ ساز و نوبت   بگفت جشن ولیعہد گشتہ خلد نظر!

پورا قصیدہ سنا تھا۔ مرور زمانہ کے ساتھ اس کے باقی اشعار یاد نہیں رہے۔ (مصنّف)

مخمس مرزا ——— بر غزل حضرت مولانا نظامی

واقعاتے کہ بہ من از فلکے روئے نمود
بتو گویم نفسے گوش اے شیخ شہود
من ماتم زدہ از کعبۂ مقصد مردود
دوش رفتم بخرابات مرا راہ نبود
مے زدم نالہ و فریاد ز من کس نشنود

دست بر حلقۂ در گوش بر آواز خبر
بر لبم نالہ و فریاد بصد خون جگر
تا کہ حالِ من دل سوختہ گردید ابتر!
نصف از شب بگذشت بیشتر و یا کم تر؟
رندے از غرفہ بر آورد سر و رخ بنمود

رُخ چو قرص قمر و مشک خطائے گیسو
لب چو یاقوت تر و چشم ز شوخی جادو
زیر لب خندہ و چین بر سر چین بر ابرو

گفتمش در بکشا گفت برو ہرزہ مگو؛
کہ درین قیم شبے بہر تو کس نکشود

اندرین دیر خرابات ہمہ رندانند
دادہ جان در عوض و ساغر مے بستانند
ہر دو عالم بخدا نیم جوے نستانند
این خرابات معان است و در او مستانند
شاہد و شمع و شراب و نے و آواز سرود

باید اول کہ تو این دلق ریائی بدری
از ہنر دست کشی پیشہ کنی بے ہنری
در فنا کوشی و از ہستیٔ خود در گذری
تا تو خواہی کہ بر از صحبت ایشاں ببری
خاک پائے ہمہ شو تا کہ تو یابی مقصود

میرزا نکتۂ وحدت ز موحد آموز؛
رو تو زخم دلت از نسخۂ توحید بدوز
صبر را پیشہ کن در نار محبت مے سوز

اے نظامی چہ زنی حلقہ براین درشب وروز
کہ ازیں آتش سوزندہ نیابی جز دود

ضمیمہ

میں نے ایبٹ آباد میں "سیاحت افغانستان" کا مسودہ فارسی زبان میں ختم کر دیا تھا۔ مگر ابھی تک اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے اردو ترجمہ کے لئے۔ اس مسودہ کتاب کو پشاور کے مشہور شاعر و ادیب محمود الحسن کوکب کے حوالے کیا تھا۔ کہ مجھے پاکستان میں ایک جدید انقلاب رونما ہونے کی اطلاع ملی ہے، جسے اگر ہم حیات نو کے نام سے تعبیر کریں تو زیادہ مناسب ہوگا، اس خوشگوار انقلاب کی رُو سے فوجیوں نے نظام حکومت کو سنبھالا۔ اور ملک کے طول و عرض میں مارشل لاء کا اجراء ہوا۔ اس خبر سے مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ کہ الحمد للہ کہ پاکستان نے تباہی اور بربادی سے نجات حاصل کی۔ اور حکومت کی باگ ڈور ایک ہوشیار دیانتدار صاحب ہمت وجرأت اور خیر خواہ ملک و ملت کے ہاتھ آئی۔ اب

انشاءاللہ پاکستان اپنے نام کی مناسبت سے حقیقی معنوں میں پاکستان کہلائیگا۔

میں نے اس کتاب میں لکھا تھا کہ - مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ مرد شریف ونجیب یعنی جرنیل محمد ایوب خان میدان عمل میں اتر آئے جنہوں نے سابقہ حکومت کی تمام خرابیوں کو دور کر کے ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کی بنیاد ڈالی، اور میری یہ دعا مستجاب ہو گئی۔

طائر دولت اگر باز گذارے بکند

مردے از غیب بروں آید و کارے

خدائے عمر درازش دہاد چندانے

کہ دست جور زمان از زمین کند کوتاہ

پشاور کے مشہور شاعر و ادیب محمود الحسن کوکب جنہوں نے میری دونوں کتابوں "نورکہستان و سیاحت افغانستان" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ نے پاکستان کے "انقلاب جدید" پر ایک نظم بعنوان "خاموش انقلاب" اظہار عقیدت کے لئے لکھی۔ موصوف نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اس نظم کو "سیاحت افغانستان" کے ضمیمہ کے آخر میں درج کروں۔ جسے میں نے قبول کر لیا ہے وہ نظم ذیل میں درج ہے "مصنف"

خاموش انقلاب

چل رہی تھی ہوائے ظلم و فساد ٭ متزلزل تھی امن کی بنیاد
سازشوں کا بچھا تھا ہر سو جال ٭ دام بردوش پھرتے تھے صیاد
تھا سفارش پہ پرمٹوں کا مدار ٭ اور رشوت تھی تکیہ گاہ مراد
رنگ رلیاں منا رہے تھے امیر ٭ کون سنتا غریب کی فریاد
تھی وزیروں میں اقتدار کی جنگ ٭ لیڈروں میں تھی چشمک اور عناد
سونے چاندی کے قصر و ایواں میں ٭ ہر سمگلر تھا ثانیٔ شداد؟
چور بازار میں تھی چہل پہل ٭ عام تجار تھے رہین کساد؟

غلہ پوشیدہ تھا ذخیروں میں ؎ تھیں ملاوٹ سے صحتیں برباد
ناگہاں لطف خاص یزداں سے ؎ باب رحمت کھلا بروئے عباد
فوج نے انتظام سنبھالا ؎ اب نہ وہ جور ہے نہ ہے بیداد
مارشل لا کی ضرب کاری سے ؎ ہل گئی قصر ظلم کی بنیاد
اب سمندر اگلتا ہے سونا ؎ اس قدر عام ہے خدا کی داد
ایک شب میں وہ انقلاب آیا ؎ کہ ہوا ختم دور استبداد

سلطنت کی بنا ہوئی محکم

صدر ایوب خان زندہ باد

محمود الحسن کوکب تبریزی۔ "دار الادب" پشاور

تمت

کتبہ محمد سعید خوشنویس پوچھوی۔ پشاور

مخمس

خلیده در جگرم خار غم چو گل کاریست ٭ برنگ غنچه همه مشق من بخونخواریست
بداغ لاله صفت دل تمام زنگاریست ٭ بنالهٔ بلبل اگر با منت سر یاریست
که ما و عاشق زاریم و کار ما زاریست

بمشک نسبت زلفش خطا بود نه نکو است ٭ به پیش کاکل او تا چه ذکر عنبر بو است
بچین بیک سر مویش دو صد ختن آهو است ٭ در آن زمین که نسیمی ز دور طرهٔ دو است
چه جای دم زدن نافه های تاتاریست

ز بند گیسوی مشکین نه رستن آسان است ٭ بزیر هر بن مو دام و دانه پنهان است
چو سنبلش همه از پیچ و تاب سامان است ٭ خیال الف تو پیچیدن نه کار خامان است
که زیر سلسله رفتن طریق عیاری است

نه این ز عارض همه پاره بتان خیزد ٭ نه این ز چشم سیه مست آهوان خیزد
نه این ز قامت رعنای نوجوان خیزد ٭ لطیفه ایست نهانی که عشق از آن خیزد
که نام او نه لب لعل و خط زنگاریست

کند اسیر محبت دلا حمیده خصال ٭ بحسن خلق توان کرد صید اهل کمال

ز سیرت ملکی آدمی رسد بجلال ٭ جمال شخص چه چشم است و ابروی عارض و خال
هزار نکته درین کار و بار دلداریست

بداد بیهوده فرهاد جان به کهساری ٭ وزین امید چو منصور گشته بر داری
جنون نمود به مجنون چه صعب ترکاری ٭ بر آستان تو مشکل توان رسید آری
عروج بر فلک سروری بدشواریست

بدست ساقی مهر و شراب میدیدم ٭ کنار مطرب شیرین رباب میدیدم
حسود را جگر از غم کباب میدیدم ٭ سحر کرشمه چشمش بخواب میدیدم
زهی مراتب خوابی که به ز بیداریست

قماش عشق بهر ژنده پوش می‌سپرند ٭ که در وفا همه ثابت قدم زیکدگر اند
گلیم دربرشان و ز نمد کله بسر اند ! ٭ قلندران حقیقت به نیم جو نخرند ؟
قبای اطلس آنکس که از هنر عاریست

غنیمت است دمی فصل گل بعشرت کوش ٭ نگار سیمبری تنگ گیر در آغوش
ببانگ چنگ و باواز نای میزن جوش ٭ بسته اند در توبه حالیا می نوش
که توبه وقت گل از عاشقان گنهگاریست

ز راه دوست به چین جمله خار و بن حافظ ٭ بصد لطافت و زمی بگو سخن حافظ

بعرض داور خطلک نکتہ کہن حافظ ۔ دلش بنالہ میازار و رحم کن حافظ

کہ رستگاری جاوید در کم آزاریست

مساوات اسلامی

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے بلال ۔ کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر

جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں ۔ جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر

ہیں غلام حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں ۔ یہ بھی سن لو کہ نہیں پاس مرے دولت و زر

ان فضیلات پہ ہے خواہش تزویج مجھے ۔ ہے کوئی جسکو نہ ہو میری قرابت سے حذر

گردنیں جھک کے کہیں متفقین ہیں کہ ہے منظور ۔ جسطرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر

عہدِ فاروق میں جس دن کہ ہوئی انکی وفات ۔ یہ کہا حضرت فاروق نے با دیدۂ تر

اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا ۔ اٹھ گیا آج نقیب حشم پیغمبر

ان مساوات پہ ہے مشعرِ اسلام کو ناز ۔ نہ کہ یورپ کے مساوات ظلم اکبر

(من کلام شبلی نعمانی)

نہ سیم و زر نہ مناصب نہ خون و رنگ و نسب

عیار عظمت انسان بلند کرداریست!

فوائدِ اتفاق

میں ہیچمدان کوئی بہت زیادہ عاقل یا علمِ نجوم اور جوتش کا ماہر نہیں
البتہ اپنی اس طویل عمر میں دنیا کے جو نشیب و فراز میں نے دیکھے ہیں
ان کا مجھے پورا پورا تجربہ ہے۔ اسی تجربہ کی بنا پر میں یہ پیشینگوئی کر
سکتا ہوں کہ چاہے جلدی ہو یا بدیر ایک نہ ایک دن یہ دونوں
اسلامی ممالک جو ایک دوسرے کے ہمسایہ ہیں۔ ایک جان
اور دو قالب کی طرح آپس میں مل جائیں گے۔ اور اس باہمی
اتحاد اور یگانگت سے نہ صرف ان دونوں مملکتوں کو ترقی و
خوشحالی نصیب ہوگی۔ بلکہ دنیا بھر کے اسلامی ممالک اس سے
مستفید ہوں گے۔ دشمنان ملّت اسلام ان دو اسلامی بھائیوں
کو جن کا نفع نقصان مشترک ہے آپس میں متحد ہوتے نہیں دیکھ سکتے
جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ مسلمان ان عظیم نقصانات
سے بچ جائیں۔ جو اختلاف اور مغائرت کی صورت میں انہیں پہنچتے ہیں

آنکہ دشمنان سرمیان مسلم و مسلم ہمیشہ باد نزاع تا زہر طرف کہ شود کشتہ فتح کفار ہست

مگر آثار و علائم سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ دشمنوں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی۔ علی الرغم اعداء پاک افغان کے درمیان خوشگوار تعلقات کا آغاز جس قدر جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

بقول شاعر ؎ من نہ میگویم زیان کن یا بہ فکر سود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

ایک بڑے عقلمند شخص کا مقولہ ہے کہ اگر کچے دھاگے کا ایک سرا ایک کے ہاتھ میں ہو اور دوسرا سرا ایک بھاری جمعیت کے ہاتھ میں پھر بھی کھینچنے سے وہ دھاگا ٹوٹ نہیں سکے گا۔ لوگوں نے پوچھا کس طرح؟ کہا "کہ فریق ثانی جتنا اس کو کھینچے گا۔ میں اتنا ہی دھاگا چھوڑتا چلا جاؤں گا"

بقولہ ؎ دو صاحبدل نگہ دارند موئے ٭ ہم ایدون سرکش و آزرم جوئے
وگر از ہر دو جانب جاہلانند ٭ اگر زنجیر باشد بگسلانند

اسی طرح ان دونوں اسلامی بھائیوں کو بھی چاہیئے کہ خیر سگالی اور رواداری کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنی خواہشات اور مطالبات میں سے کچھ ایک فریق چھوڑ دے۔ کچھ دوسرا فریق۔ تو اس صورت میں ان دونوں بھائیوں کی مغائرت کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ملت اسلامیہ کے ہر بہی خواہ فرد پر یہ لازم ہے کہ وہ اس کار خیر میں حصہ لے اللہ تبارک وتعالیٰ اسمیں کامیابی عطا فرمائیگا۔ ؎

زاتفاق مگس شہد می شود پیدا٭ خدا چہ لذت شیریں در اتفاق نہاد

دوم اس کتاب کے ذریعہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ضروری گذارش حکومت افغانستان کے گوش گذار کروں۔ کہ میرے جد امجد مرحوم میر مسجدی خان غازی وشہید نے اپنے بھائی اور بیٹوں کے ساتھ۔ افغانستان کی پہلی لڑائی میں جو افغانوں اور انگریزوں کے درمیان سنہ ۱۸۴۱ء میں واقع ہوئی تھی جنگ آزادی کا آغاز کیا تھا جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں ثبت ہیں نیز ایک فارسی مثنوی طبع شدہ کابل موسوم بہ جنگنامہ مصنفہ غلامی جو خود بھی اس لڑائی میں موجود تھا میں واقعات بالتفصیل درج ہیں۔ علاوہ بریں دو انگریز خواتین کی تصانیف "ججمنٹ آف سورڈ" مصنفہ MAUD DIVER (ماوڈ ڈائیور) اور "روزنامچہ لیڈی سیل" (LADY. SALE) موسوم بہ شب خون افغان" صفحات نمبر ۲۲ و ۲۲۹ میں لکھا ہے کہ میکناٹن نے اس مرد مجاہد کی سرگرمیوں سے تنگ آ کر اپنے سیکرٹری کے ذریعہ ایک شخص مسمی عبدالعزیز کو آٹھ ہزار روپے

دیئیے۔ جس نے میر صاحب موصوف کو زہر دیکر شہید

کردیا۔

اب سیاحت افغانستان کے دوران میں میں نے چاریکار

کے قریب موضع خواجہ خضری میں دیکھا کہ اس مرد مجاہد

کا مزار ایک گمنام قبرستان میں واقع ہے۔ افغانستان

کی ملّت پرور حکومت جو ممالک غیر میں بزرگان دین اور شعرائے ملی

کے مزارات اور مقبروں کی تعمیر ترمیم پر روپیہ صرف کرتی ہے اُسے

چاہیئے کہ وہ اپنے ملک کے مجاہدین مثلاً مرحوم میر مسجدی خان شہید امین اللہ

خان لوگری۔ محمد عثمان خان و محمد جان خان غازی کے مقبروں کیطرف

بھی توجہ مبذول کرے۔ تاکہ موجودہ اور آئندہ نسل کے نوجوان اپنے
اسلاف گرامی کی یادگاروں کو دیکھ کر انکی قربانیوں سے آگاہ ہو جائیں
اور ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے وطن عزیز پر جان قربان کرنے
کا ان میں مقدس جذبہ پیدا ہو جائے۔

حسنت بہ اتفاق ملاحت جہاں گرفت
آرے بہ اتفاق جہاں میتواں گرفت

غزل

شمیم خلد گدائے بہار کوہستان ٭ شگفتگی گلِ خارِ دیارِ کوہستان
لب پیالۂ زبتخالِ رشک می سوزد ٭ کہ نشّۂ وقفِ لبِ جوئبارِ کوہستان
اگرچہ پایۂ بعشنگیست قامت سرو ٭ عنانِ ہوش بہ دستِ چنارِ کوہستان
بہ دیدہ خاصیّت توتیا دہد لیکن ٭ بچشم آن چہ نیاید غبارِ کوہستان:
بہ راہ جادہ نتوان شناخت از جدول ٭ چہ آبہا است کہ بر روئے کارِ کوہستان
پیام عالمِ بالا کہ گوش تشنۂ اوست ٭ ترانہ ایست کہ با آبشارِ کوہستان

گذشتن از لب ساقی گلعذار اے دل
خنک چو توبۂ مے در بہار کوہستان:

(بہ تصرف غزلی ابوطالب کلیم)

غزل حضرت عبدالقادر بیدلؒ

ز عمر یک دمہ بے یادِ کردگار چہ حظ ؎ دمے کہ نیست حضورِ گل از بہار چہ حظ

طراوتِ لبِ معشوق اگر نہ در نظر است ؎ ز دیدن گہر و لعل آبدار چہ حظ

اگر دماغ نہ دارد جنونِ گیسوئے ؎ ز سنبل چمن و نافۂ تتار چہ حظ

دمے کہ جلوہ نباشد دلیل بینائی ؎ ز جوہر آئینہ را غیر خار خار چہ حظ

اگر نہ بوسۂ کنج لبے بود منظور ؎ بجام بادہ زخمیازۂ خمار چہ حظ

ز شوق چشمِ تماشہ کشودۂ لیکن ؎ بہ فہم جلوہ نہ گر دیدۂ دوچار چہ حظ

بہ صیدگاہ طلب رو کہ عیش دنیا را ؎ کنی شکار چہ سود ار شوی شکار چہ حظ

گل مراد ولے ار نیاید از دستت ؎ ز دستگاہ چہ حاصل ز گیر و دار چہ حظ

به جمع مال نباید گداخت جوهر امن — بغیر کاهش طبع از گهر به تار چه خط

حریص عافیت از آتش طمع سوزد — ز کف کشودن دایم کند چنار چه خط

به این دو روزه اقامت که در جهان داری — اگر به کام تو گردید روزگار چه خط

مزاج غافل اگر قدردان عزلت نیست — ز طبع موج گهر را بجز فشار چه خط

بجیب خویش صدف وار گوهرے داری — بسان موج دویدن به هر کنار چه خط

چو صبح یک دو نفس بیش نیست فرصت عمر — ز درد و جبر چه کلفت به اختیار چه خط

تغافل است تماشائے راحتِ دنیا — بچشم خر مژه پوشیدن از غبار چه خط

نمودنی است به وحدت حساب خویش درست
هوس شماری اسباب بیشمار چه خط !

الغیب عند اللہ

کتاب ہذا کی کتابت ختم ہو چکی تھی کہ روزنامہ شہباز پشاور مورخہ ۱۶ر فروری ۱۹۵۹ء میں ایک خبر نگاہ سے گزری "کہ سرزمین پشاور کے نیچے ایک بڑی چٹان ہے اور یہ ارد گرد کے پہاڑوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ پشاور اور اس کے قرب وجوار کے تمام چشموں کی سطح یہی چٹان بتائی جاتی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ یہ چٹان پھٹ جائے تو اس کے نیچے سے اتنا پانی نکلے گا۔ کہ پشاور کی ساری وادی ایک بہت بڑی جھیل میں منتقل ہو جائے گی۔"

اسی طرح ایک دفعہ کشمیر میں اخبار مارتنڈ میں بھی ایک پیشین گوئی شائع ہوئی تھی۔ جس نے کئی ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کر کے ریاست بھر میں ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا تھا۔ حالانکہ عقل انسانی اسبات کو باور کر ہی نہیں سکتی۔ کہ کل کیا ہو گا۔

سرّ غیبی کس نمے داند بجز پروردگار
گر کسے گوید کہ من دانم ازو باور مدار

وہ خبر یہ تھی کہ کوہ تخت سلیمان جو ڈل کے کنارے پر واقع ہے عنقریب آتش فشاں مادہ کی وجہ سے پھٹ کر جھیل ڈل میں گر جائے گا۔ اور ڈل کا پانی میلوں تک پھیل کر سرینگر کو طوفانِ نوح کی طرح غرقِ آب کر دے گا۔ اس افواہ کے پھیلنے کی دیر تھی کہ ہزاروں سیاح جو کشمیر میں سیر و سیاحت کے لئے آئے تھے۔ خوف و ہراس میں مبتلا ہو کر یہاں سے بھاگنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہر طرف بھگدر مچ گئی۔ موٹروں کا کرایہ جو سو روپیہ تھا۔ وہ پانچ اور چھ سو روپیہ تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ چند دنوں کے اندر اندر کشمیر کی وادی سیّاحوں سے خالی ہو گئی۔

حکومت کو جب اسکی اطلاع پہنچی اور اس نے اخبار مارتنڈ کے ایڈیٹر سے اس خبر کے شائع کرنے کے

بارے میں پوچھ گچھ شروع کی۔ تو اس نے کہا کہ میں نے تو یکم اپریل کو یہ خبر شایع کر کے عوام کو "اپریل فول" بنایا تھا۔۔۔۔ سبحان اللہ کسی کی جان گئی۔ آپ کی ادا ٹھہری۔

یہی حال اخبار شہباز کا ہے جس نے ایک بے حقیقت خبر شایع کر کے عوام میں خوف اور دہشت پھیلا دی۔

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے

ع حیرتم کہ دشمنی کفر و دین چرا است؟ از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

یہ ایک آزمودہ حقیقت ہے کہ جسے پروردگار عالم اپنے سایۂ حفاظت میں جگہ دے۔ وہ تمام زحمتوں اور تہلکوں سے محفوظ رہتا ہے۔ بقول شاعر:-

اگر تیغ عالم بجنبد ز جا نہ بردہ رگے تا نہ خواہد خدا

مگر شرط یہ ہے کہ انسان صرف ذات باری تعالیٰ کو اپنا کارساز حقیقی خیال کرے۔ جسے اللہ پرماتما گاڈ اور خدا کے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے

گفتگوئے کفر و دین آخر بہ یک جا مے رسد۔
خواب یک خواب است و باشد مختلف تعبیر ہا!

اور ہر قسم کی امداد و استعانت اسی ذات یگانہ سے طلب کر کے ہر مرحلۂ حیات میں اسی کو مشکلکشائے

برحق اور قابل پرستش تصوّر کرے۔ ایسا راسخ العقیدہ انسان نہ دنیا میں بھوکا اور ننگا رہ سکتا ہے۔ نہ عقبیٰ میں موردِ عتاب و شرمندگی ہو سکتا ہے۔

بقولہٖ:- الا اِنَّ اولیاء اللّٰہ لا خوف علیہم ولا ھُمْ یحزنوُن۔

ترجمہ:- یاد رکھو جو لوگ صرف اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتے ہیں۔ وہ نہ دنیا میں خوف زدہ ہوتے ہیں، نہ عقبیٰ میں موردِ عذاب و پریشانی

بقول حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی رحؒ

ابرو باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بہ کف آری و بغفلت نہ خوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نہ بری

ایسی صورت میں عقلِ سلیم اسباب کو تسلیم نہیں کرتی۔ کہ ایسا انسان تنگیِ معاش میں گرفتار ہو کر بے

نان و نفقہ رہے - بقول حضرت بیدل

بہ عقل نازی حکیم! تا کے؟ بہ فکرت ایں رہ نمے شود طے
بہ کنہ ذاتش خرد برد پے اگر رسد خس بہ قعر دریا

منجملہ بیسیوں واقعات کے جو مجھ پر گذرے ہیں۔ مشتِ نمونہ از خروارے تین واقعات کا یہاں ذکر کرتا ہوں۔

میری عمر پانچ سال تھی۔ میری اتالیقہ جسے میں ننہ کہتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ شہر کابل میں اپنی ہمشیرہ کے گھر لے گئی تھی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس کی ہمشیرہ کا مکان منگ والا تھا۔ گھر کے لوگ کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا ایک ہم عمر بچہ کوٹھے پر میرے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ ایک ٹوٹے ہوئے چرخے کی نواڑ کا ایک سرا میرے ہاتھ میں اور دوسرا سرا میرے ہمجولی کے ہاتھ میں تھا میں پیچھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ کہ قضائے کار منگ کے

راستے تقریبًا دس فٹ کی اونچائی سے میں کوٹھے سے نیچے جا پڑا۔ وہاں ایک دیوانہ عورت بیٹھی تھی جس کے بال اُلجھے ہوئے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جب میں نیچے گر پڑا تو وہ دانت پیستے ہوئے میری طرف بڑھی۔ اور غصّے کی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میری اتالیقہ۔ اسکی ہمشیرہ اور دو تین اور خواتین دوڑ کر زینے کے راستے نیچے اتر آئیں۔ اور مجھے اٹھا کر اوپر لے گئیں۔ میرے بدن میں کسی قسم کا درد یا صدمہ وارد نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ میرے خاک آلود کپڑوں کو جھاڑ کر حد درجہ پریشان ہوئے۔ اس ملک کے رواج کے مطابق انہوں نے کچھ آٹا اس دیوانہ عورت کو دیا۔ اور جٹ عورت کو بلا کر میری پیٹھ سے خون نکلوایا۔ کوٹھے سے گرنے پر تو مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ البتہ خون نکالنے

سے مجھے دکھ ہوا۔ میری آتالیقہ نے مجھے تاکید کی کہ میں اس واقعہ کا ذکر اپنی والدہ سے نہ کروں۔ میں اپنی اس آتالیقہ سے جو اکثر اوقات تنبیہاً مجھے زدوکوب بھی کیا کرتی تھی۔ بہت ڈرتا تھا۔ اس لئے گھر والوں کو اس واقعہ کی خبر تک نہیں دی۔

دوئم:۔ عہد جوانی میں ایک دفعہ میں ایک کوہستانی قریہ میں رات کے وقت غلطی سے کوٹھے سے نیچے گرا۔ نیچے پتھر بھی تھے۔ مگر نگاہدار حقیقی نے مجھے بچا لیا۔ اور مجھے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔

سوم:۔ ۱۹۰۸ء میں جب کہ میں جوان تھا۔ اپنے ایک دوست پرمانند کے ساتھ پشاور میں اس کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھا اکل شرب میں مشغول تھا۔ کھانا کھانے کے بعد رات کے ۱۰ بجے میرا میزبان اپنے ایک دوست سے کمرے کے ایک طرف باتیں کرنے لگا۔ اور میں رخصت لے کر باہر جانے لگا۔ میرے ایک ہاتھ میں سیگریٹ

تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر میزبان کو خدا حافظ کہا۔ اور غلط دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یہ دروازہ صحن کی طرف کھلتا تھا۔ جو گیارہ فٹ نیچے تھا۔ میں سیدھا صحن میں جا پڑا۔ میں نے اپنے جسم کی ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کی آواز بھی سنی۔ میزبان اپنے ملازم کے ساتھ سراسیمہ و پریشان زینے کے راستے نیچے اترا۔ مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ چند قدم ادھر ادھر ٹہلا۔ اس نے برانڈی کا ایک گلاس فی الفور مجھے پلا دیا۔ میں اپنی گگ میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ میرے سونے کا کمرہ تیسری منزل میں تھا۔ وہاں جا کر میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میری عادت ہے کہ میں رات کو اکیلے کمرے میں سوتا ہوں۔ اس رات کو میں نے اپنے ملازم خسرو خان سے کہا کہ وہ بھی میرے کمرے میں قالین پر سو جائے۔ وہ حیران تھا کہ کیا ہوا ہے۔ مجھے رات کو کبھی نیند آتی تھی۔ کبھی بیدار رہتا تھا۔ خواب میں بھی کوٹھے سے

نیچے گرنے کا یہ واقعہ مختلف صورتوں میں مجھے نظر آتا تھا۔

صبح اٹھا تو میرے اعصاب میں خفیف سا درد اور بدن سست تھا۔ کچھ حرارت بھی تھی۔ ڈاکٹر عطا محمد خان کو بلایا اس نے میرے جسم کا معائنہ کیا تو کسی قسم کی خراش بدن میں واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسنے کونین کی چند گولیاں اور اسپرین کھانے کیلئے دی۔ اور میری پسلیوں پر پلاستر لگایا۔ میں نے کہا اسکی کیا ضرورت ہے۔؟ کہا احتیاطاً لازم ہے۔

اسی طرح مجھ پر جنگلی بھالو کے حملے کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس حملے کے دوران میں ہم دونوں کے چہروں کا فاصلہ ایک فٹ تھا۔ اگر وہ صرف ایک چنگل میرے منہ پر مار دیتا تو میرے چہرہ اور آنکھوں کو پارہ پارہ کر دیتا۔ اگر میں زندہ بھی رہ جاتا تو میرے چہرہ کی یہ حالت نہ ہوتی جو اب دیکھنے میں آتی ہے۔ البتہ حفاظت کرنیوالے نے حفاظت کی اور میں بچ گیا۔ میری تصنیف نور کہستان میں یہ واقع بالتفصیل درج ہے۔

اسی طرح میں کئی مرتبہ گھوڑا - بائیسکل اور گاڑی وغیرہ سے گر چکا ہوں - جن کا بیان خالی از طوالت نہیں - مگر حافظ حقیقی نے مجھے ہمیشہ بچایا - اور آج تک زندہ وسلامت موجود ہوں - اے خدا، قربان احسانت شوم

این چہ احسان است قربانت شوم

دو سال ہوئے کہ بری طرح گر گیا تھا - چاہیئے تو یہ تھا کہ میرے تمام اعضاء ٹوٹ جاتے مگر صرف کمر میں چوٹ لگی - جس سے نہ تو کمر کا پنجرا ٹوٹ گیا نہ پسلیاں ٹوٹیں - چند ماہ تک تکلیف رہی اب اللہ کے فضل سے بالکل تندرست ہوں -

ایک قدیم واقعہ

ایک قدیم واقعہ یاد آگیا جسے ناظرین کی تفریح خاطر و تفنّن طبع کے لئے درج کرتا ہوں۔

۱۹۰۶ء میں میں سردار محمد اسمٰعیل خان سفیر حکومت افغانستان کے ہاں جو ویسرائے ہند کے دربار میں مقرر تھا وہ شملہ میں مہمان تھا۔ کہ وزارت خارجہ ہند کے اتاشی خان بہادر مولابخش خان جنہیں بعد میں نوابی کا خطاب ملا تھا۔ بھی تشریف لائے۔ سفیر صاحب اور اتاشی موصوف دونوں ایک کمرے میں تنہا بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد خان بہادر صاحب تو واپس چلے گئے۔ اور سفیر صاحب ایک لفافہ ہاتھ میں لئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اور اپنے سر کاتب عبدالواحد خان کو بلا کر وہ لفافہ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور فرمایا کہ اعلیٰحضرت امیر حبیب اللہ خان کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کرے۔ کہ اتاشی ہند ویسرائے کی طرف سے دعوت نامہ لے کر آیا ہے

کہ اعلیحضرت شاہی مہمان کی حیثیت میں چار مہینے کے لئے بغرض سیاحت ہند تشریف لائیں - یہ عریضہ کسی افسر کے ہاتھ جسے وہ مناسب سمجھے جلد از جلد کابل روانہ کیا جائے تاکہ اس کا جواب آنے پر موزون انتظامات عمل میں لائے جائیں ۔

۱۹۰۷ء میں امیر صاحب موصوف اپنے مخصوص اہل دربار و مصاحبین ایک مختصر شاہی رسالہ اور ضروری خدمت گاروں کے ساتھ پشاور روانہ ہوئے - کابل میں مقیم انگریزی سفیر فقیر افتخارالدین مرحوم بھی آپ کے ہمرکاب تھے - سردار محمد اسمٰعیل خان بھی پشاور پہنچ کر آپکی پیشوائی کے لئے روانہ ہو گئے ۔
امیر صاحب کا قافلہ جلال آباد سے آگے بڑھا ہی تھا کہ سفیر موصوف نے شرف دست بوسی حاصل کر کے عرض کیا۔ کہ اعلیحضرت کو آج تک انگریزی حکومت " ہز ہائی نس " کے خطاب سے یاد کرتی ہے - اب یہ بہت اچھا موقع ہاتھ لگا ہے ۔ میں پشاور واپس جاتا ہوں - آپ اپنی رفتار کو

آہستہ کریں۔ میں انگریزی حکومت کے نمائندے سے کہوں گا۔ کہ آگرہ کے دربار میں کئی نواب اور راجے مہاراجے شامل ہوں گے۔ امیر صاحب اس دربار میں ان کے ساتھ یا ان سے کچھ بالاتر سہی بیٹھیں گے۔ تو حکومت افغانستان اور غیور ملت افغان اسے اپنے بادشاہ کی توہین تصور کریگی اگر امیر صاحب کو جو ایک خود مختار بادشاہ ہے انگریزی حکومت ہز مجسٹی کی حیثیت میں پہچانے تو وہ تشریف لائیں گے۔ ورنہ واپس چلے جائیں گے۔ انگریزی حکومت کسی صورت میں بھی یہ گوارا نہیں کرے گی کہ آپ واپس جائیں۔ اور وہ دنیا بھر کی نگاہوں میں بدنام ہو کر افغانستان کی دشمنی مول لے۔ آپ کا یہ مطالبہ ضرور قبول کیا جائے گا۔ اور آپ افغانستان کے بادشاہ بن جائیں گے۔ امیر صاحب نے اس تجویز کو منظور کر کے سفیر موصوف کو پشاور جانے کی اجازت دیدی۔

ان دنوں صوبہ سرحد کا چیف کمشنر سر ہلرڈ ڈین

تھا۔ اس نے ٹیلیگرام کے ذریعہ یہ مطالبہ ویسرائے کے سامنے پیش کیا۔ ویسرائے نے لندن سے گفتگو کی انگریزوں نے مجبور ہو کر امیر صاحب کے حسب خواہش آپ کے مطالبہ کو منظور کر لیا۔ اس میں ایک شرط یہ تھی کہ انگریزی حکومت اعلیحضرت کو اس صورت میں ہز میجسٹی تسلیم کریگی۔ کہ موصوف حسب دستور سابق دنیا کے کسی اور بادشاہ سے براہ راست تعلقات قائم نہیں کریں گے۔ اس شرط کو امیر صاحب نے منظور کر لیا۔ سچ پوچھیئے تو ڈپلومیسی میں افغان مدبّر انگریزوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ اور اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے میں انہیں کافی مہارت حاصل ہے۔

۱۹۰۷ء میں امیر صاحب پشاور پہنچے۔ اور پشاور کے مہمان خانہ میں جو اب لیڈی گرفت زنانہ ہائی سکول کے نام سے موسوم ہے۔ فروکش ہوئے۔ سر ہنیری میک موناں اور سر ہنیری ڈاب آپ کے مہماندار مقرر ہوئے۔ جمعہ کی نماز مسجد مہابت خان میں ادا کی گئی۔ جس میں آپ نے امامت کی

پشاور میں دو یوم قیام کرنے کے بعد آپ آگرہ تشریف لے گئے۔ جہاں وائسرائے ہند اور دیگر سول اور فوجی افسروں نے آپ کی خاطر خواہ پذیرائی کی۔ شاہی دستے نے آپ کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ آپ کے اعزاز میں مختلف تقریبات منعقد ہوئیں۔ ہر قسم کی مہمانداری اور آؤ بھگت عمل میں آئی۔ یہاں سے آپ کلکتہ اور بمبئی کی طرف روانہ ہوئے گوالیار میں وہاں کے مہاراجہ کے ساتھ شیر کا شکار کیا۔ علی گڑھ میں کالج کا معائنہ کر کے یہاں کی تعلیمی ترقی اور حسن انتظام کے متعلق اظہار خوشنودی فرمایا۔ اور ایک معتدبہ رقم کالج فنڈ میں بطور عطیہ دے کر کچھ سالانہ امداد بھی مقرر کی۔ بمبئی میں انگریزی حکومت نے اطلاع دی کہ ایک دن کیلئے امیر صاحب سرکاری مہمان کی حیثیت میں شہر بھر میں جس قدر خریداری کریں گے اسکی رقم انگریزی حکومت ادا کرے گی۔ غالباً اس دن امیر صاحب نے کوئی چیز نہیں خریدی۔

کلکتہ میں افغانی سفیر نے امیر صاحب کو اپنی قیام گاہ میں
دعوت دیکر عرض کیا کہ گوہر جان رقاصہ حد درجہ خوش گلو
ہے اگر اجازت ہو تو اس کا گانا حضور کو سنوایا جائے امیر
صاحب نے فرمایا اب دیر ہو گئی ہے اس کے آنے میں ایک
عرصہ لگے گا۔ سفیر صاحب نے پہلے ہی سے گوہر جان کو
اپنی جگہ پر بلایا تھا۔ عرض کیا کہ بس دو منٹ میں وہ
حاضر ہو سکتی ہے۔ امیر صاحب نے فرمایا کوئی ضرورت نہیں
سفیر صاحب نے مکرر عرض کیا تو فرمایا کہ اسبارے میں
استصواب رائے کرنا چاہیئے۔ جب رائے لی گئی، تو کثرت
رائے سفیر صاحب کی طرف تھی۔ امیر صاحب نے فرمایا کہ
بادشاہوں کی گیارہ رائیں ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود
کثرت رائے سفیر صاحب کی طرف تھی۔ امیر صاحب غسلخانہ
جانے کے بہانے مجلس سے اٹھ کر نیچے چلے گئے۔ اور موٹر
میں بیٹھ کر گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ باقی مصاحبین
محفل میں بیٹھ کر گوہر جان کے ساز و سرود کا لطف اٹھاتے

رہے ۔ دوران سیاحت میں بعض لوگوں نے سردار محمد اسمٰعیل
خان کی طرف سے امیر صاحب کو بدظن کر دیا ۔ بقول شاعر ؎

چو نیک شدی غافل از حسود مباش
کہ خار دیدۂ بدبخت نیک بختانند

نیز بچوں کی بات اور صورت اور بادشاہوں کی مہربانی
پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ اول الذکر ایک سال
میں تبدیل ہوتی ہے اور آخر الذکر ایک خیال میں !

ہندوستان سے واپسی پر امیر صاحب نے سفیر کو حکم دیا
کہ وہ آپ کے ساتھ کابل جائے ۔ عقلمند سفیر سمجھ گیا کہ کابل جانے
میں اسکی خیریت نہیں ۔ عرض کیا کہ ایک نایاب الماس موسوم
بہ دریائے نور جو اعلیحضرت شاہ شجاع کے تاج میں لگا ہوا
تھا ۔ اور جو شجاع الدولہ کے ہاتھ لگا تھا اب اس کی پوتی
امین الدولہ کی بیٹی کے پاس موجود ہے ۔ اس نے مجھے لکھا
ہے کہ اس گوہر نایاب کو شاہ افغانستان کے حضور میں پیش
کروں ۔ اگر حضور کی خواہش ہو تو میں امرتسر جا کر اس الماس

کو لیکر آپ کے پیچھے کابل آجاؤں۔ الماس کی خواہش نے امیر صاحب کو فریفتہ کر دیا۔ فرمایا کہ جس قدر جلد ممکن ہو۔ سفیر مذکور امرتسر جاکر اسے حاصل کرے اور جلال آباد میں بمعہ الماس حاضر ہو جائے۔ امیر صاحب تو اپنے قافلہ کے ہمراہ خیبر سے گذر گئے۔ اور سفیر باتدبیر جمرود سے پشاور آکر اپنے ماموں خیل قاضیوں کے گھر میں مصروف خورد و نوش ہوئے اور آرام سے بیٹھ رہے اور چند دنوں کے بعد دہلی جا کر اپنے سفارتخانہ میں مصروف کار ہوئے۔ اور امیر صاحب کی خدمت میں ایک عرضی روانہ کی کہ الماس نہیں ملا۔ کوشش کر رہا ہوں۔ مالکہ مفت نہیں دیتی۔ قیمت مانگتی ہے دو تین مہینوں تک یہ خط و کتابت جاری رہی۔ امیر صاحب سمجھ گئے کہ سفیر مذکور بہانے تراش رہا ہے۔ اسے سفارت سے معزول کر کے اسکی جگہ سردار عبدالعزیز کو مقرر کیا جس نے دہلی آکر چارج لے لیا۔ سردار محمد اسمٰعیل جس نے کافی رقم جمع کر لی تھی۔ ہندوستان میں کبھی کشمیر میں اور کبھی کوئٹہ میں قیام پذیر

ہوتا تھا۔ اس نے کوئٹہ میں ایک خوشنما بنگلہ بھی تعمیر کیا تھا۔

ہمارے ملک میں جشن میّت

انہی دنوں میرے ایک محترم دوست کا انتقال ہوا خدا رکھے متوفی مرحوم کے فرزندان ارجمند صاحب مال و دولت اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ ہر ایک کے پاس ملازم اور موٹریں وغیرہ موجود ہیں۔ جس وقت سے موصوف نے جان شیرین جان آفرین کو سپرد کی۔ خورد و نوش کے اہتمام و انتظام کے لئے تگ و دو شروع ہو گئی۔ گھی۔ گوشت چاول خوانچے کا سامان۔ فرینی۔ یاقوتی۔ قورمہ۔ آچار۔ مربا سبزی۔ حلوہ پلاؤ خوری کے لئے ظروف چینی۔ پان سیگریٹ اور زردہ تمباکو کی فراہمی کے لئے دوڑ دھوپ جاری ہو گئی ادھر جنازہ قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ اور ادھر باورچی دیگیں چڑھانے لگے۔ تین شبانہ روز تک یہ ہنگامہ لگا رہا

ایک معمر خاتون اندر سے آواز دیتی ہے۔ پان تمباکو ختم ہوا۔ جلدی انتظام کیجئے۔ دوسری کہتی ہے ایک مہمان کا چھوٹا بچہ رات سے بخار میں مبتلا ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر بلوایا جائے تیسری چلاتی ہے مہمانوں کے بچوں کو بھوک لگ رہی ہے۔ اندر کھانا فی الفور بھجوا دو۔ وغیرہ۔ اور اب ورثائے میّت کیلئے یہ ضروری ہے کہ مہمانوں کے ان تمام احکام کی تعمیل کریں۔ ورنہ برادری میں ناک کٹ جاتی ہے۔ متوفی کے صاحب استطاعت ورثا تو جوں توں کر کے ان مفت خوروں کی ہر خواہش کو پورا کر لیتے ہیں۔ ولئے برحال ورثائے غریب و نادار جنہیں گھر بار رہن رکھ کر یا سودی قرضہ لے کر ان رسومات قبیحہ کو ادا کرنا پڑتا ہے

ان رسومات میں چہلم کی رسم بھی شامل ہے۔ جس میں دعوت ولیمہ کی طرح دعوتی رقعے بانٹے جاتے ہیں۔ خوانچہ کی روٹی پکائی جاتی ہے۔ دوست احباب اور اقربا جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں۔ سبحان اللہ یہ ہے اتباع سنت رسول

بقول شاعر:- ادھر میّت پڑی ہے اور ادھر دیگیں چڑھاتے ہیں

پلاؤ اور قورمے کی دعوتیں احباب اڑاتے ہیں

کہیں قل ھو پڑھاتے ہیں کہیں چہلم مناتے ہیں

نکمے بے عمل ملا ۔ ہماری جان کھاتے ہیں

نہیں روزِ جزا کا خوف انکے دل میں ہے مطلق

یتیموں اور بیواؤں کا حق کھاتے ہیں یہ نا حق

مسلمانو ذرا سوچو یہ بدعنوانیاں کبتک ٭ یہ فاقہ مستیاں کبتک یہ تن آسانیاں کبتک

یہ ظاہرداریاں کبتک یہ نافرمانیاں کبتک ٭ یہ لچی قتلمے کبتک یہ باقرخانیاں کبتک

نمود و نام پر ملّت کو تم بدنام کرتے ہو

مگر خویش و اقارب کے دلوں کو شاد کرتے ہو

اب میں صدر محترم پاکستان کیخدمت میں عرض کرتا ہوں، کہ جس طرح آپنے چوربازاری، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، سمگلنگ اور دیگر بدعتوں سے ملک کو پاک و صاف کیا - اسی طرح رسوماتِ قبیحہ کے انسداد کی طرف بھی توجہ مبذول کر کے گورنروں، کمشنروں اور دیگر افسرانِ متعلقہ کے نام احکام جاری کرائیں۔ کہ وہ

جلسوں، جرگوں اور دیگر تقریبات کے موقعوں پر اپنی تقاریر میں عوام کو ہدایت کریں کہ یہ تمام رسومات ناجائز ہیں۔ اگر خدا نے کسی کو توفیق عطا کی ہے تو وہ حسب استطاعت خود کسی اسلامی مدرسہ یتیم خانہ یا دار المساکین کے امدادی فنڈ میں روپیہ داخل کرے یا کسی غریب طالب علم کے نام وظیفہ جاری کرے تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ملک و ملت کو فائدہ پہنچا سکے۔

دوم:۔ جس وقت میّت دفن ہو جائے جنازہ میں شامل ہونے والے احباب وغیرہ دعائے مغفرت مانگ کر رخصت ہو جائیں۔ نہ کہ طعام خوری کیلئے ورثائے میت کے گھر کا رخ کریں فاتحہ خوانی کے لئے تین دن مقرر ہوں۔ تاکہ گرمی اور سردی کے موسم کے مطابق صبح یا بعد دوپہر جب کہ خورد و نوش کا وقت نہ ہو دو گھنٹے تک لوگ آکر رسم فاتحہ خوانی ادا کریں۔ خود بھی اپنے اپنے کام کاج میں لگ جائیں۔ اور میّت کے ورثاء کو بھی کاروبار کرنے دیں۔ ان تین دنوں میں متوفی کے رشتہ داروں کو چاہیئے کہ وہ اپنے گھروں میں کھانا پکا کر صاحب میّت کے گھر پہنچائیں۔ تاکہ

ان غمزدوں کو کھانا پکانے کی زحمت سے بھی نجات ملے۔ اسی
طرح خواتین کو بھی چاہیئے کہ کچھ دیر بطور تعزیت میّت والوں کے
گھر بیٹھ کر اور انہیں تسلّی دیکر اپنے اپنے گھروں کو چلی جائیں۔

موسم سرما میں چلائے۔ بالائی، روغنی۔ نان وغیرہ کے علاوہ وڑثائے
میّت کو بستروں کا انتظام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے دوستوں
اور شناساؤں کے گھروں سے تکیے، لحاف، سوزنیاں اور توشکیں وغیرہ
مانگنی پڑتی ہیں۔ اب اگر کوئی چیز گم ہو گئی تو اس کی قیمت ادا کرنی
ایک مصیبت اور اگر وہ دوست تاوان نہ لے تو دوسری شرمندگی

خدا ہم سب کو یہ توفیق عطا کرے کہ ہم ان بدعات
کو ترک کر کے ساری قوم کو ان کے نتائج و عواقب سے
آگاہ کریں۔

ایک ضروری گذارش

میں نے کتاب ہذا کے صفحہ ۲۵ امیں بعض ان غداران وطن وزیروں لیڈروں اور افسروں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد پر ملک و ملت کے مفاد کو قربان کر کے وطن عزیز کو سیاسی اور اقتصادی مصائب میں مبتلا کیا تھا۔ اسی ضمن میں ہمیں اس دور کے با اقتدار اراکین مملکت کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ جو اپنے اختیار کے زمانے میں بھی ان کی برائیوں میں شامل نہیں ہوئے۔ مگر وہ نیک لوگ بھی بری جماعت میں مخلوط ہو کر بدنام ہو گئے ہیں۔ جیسے جنگل میں آگ لگنے سے خشک اور تر برابر جل جاتے ہیں۔ وہ اشرار ابھی تک اپنی سازشوں اور برائیوں سے باز نہیں آئے ہیں۔ خدا سب کو ہدایت دے۔